کہانیوں کا مجموعہ
آنگن میں وہ
مشتاق مہدی

مشتاق مہدی کے افسانوں میں بیان کنندہ ایک عاید کردہ کردار نہیں۔
وہ مصنف کی گرفت سے نکل کر افسانے کے تخلیقی ماحول میں تداخل کا ارتکاب نہیں
کرتا۔ اس کے برعکس وہ افسانے کی فرضی دنیا کا زائدہ اور پرداختہ کردار ہے۔ وہ
افسانوی دنیا میں اپنے فائدے کی باریکی، نفسیاتی کوائف اور فضا سازی میں کسی
گراں باری سے نہیں بلکہ برجستگی سے نمو پزیر ہوتے ہیں یعنی اپنے اسلوب گفتار
اور عمل اور ردعمل کو مربوط، رواں اور منضبط ارتقائی صورت میں پیش ہی نہیں کرتے
بلکہ اپنے تجربات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں سریلی انداز میں رچروے کر ہی
اُبھارتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کے افسانے پامال شدہ حقیقت نگاری کی نذر
نہیں ہوتے۔
(پروفیسر حامدی کاشمیری)

کہانیوں کا مجموعہ

آنگن میں وہ

مشتاق مہدی

نام کتاب: آنگن میں وہ

صنف: افسانے

مصنف: مشتاق مہدی

پہلا ایڈیشن ۲۰۰۹_۲۰۱۰ء

کمپیوٹر کمپوزنگ: المختار پبلی کیشنز: اسلام آباد کشمیر

سرورق: عادل مختار —— مطبع: رہبر آفیسٹ دہلی

تعداد: پانچ سو

قیمت: Rs 370/-

پبلشر: مہدی پبلی کیشنز: ملہ باغ حضرت بل سرینگر۔

کتاب ملنے کا پتہ

☆ مشتاق مہدی، مدینہ کالونی، ملہ باغ، حضرت بل سرینگر 190006

موبائل: —— 9419072053

☆ المختار پبلی کیشنز: نئی بستی اسلام آباد کشمیر

☆ کتاب گھر لال چوک سرینگر

اِس کتاب کی طباعت کے لئے جموں کشمیر اکیڈمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز سے مالی امداد حاصل کی گئی ہے۔
اس کتاب میں ظاہر کی گئی آراء سے کلچرل اکادمی کا بلواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق نہیں اور نہ اس ضمن میں کلچرل اکیڈمی
پر کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے

انتساب

تاریک رات کے

اُن مسافروں کے نام

جو راہ میں کھو گئے

اور اُن آنکھوں

کے نام

جو سحر کے انتظار میں

بیدار ہیں

اپنے والدِ محترم

مرحوم غلام مصطفےٰ شاہ

کی یاد میں نہایت ادب کے ساتھ

وہ ایک شریف النفس، نیک، دور اندیش صوفی طبعیت کے انسان تھے.....اللہ اُنہیں مغفرت فرمائے...

کہانی کے حوالے سے جو کچھ باتیں اُنہوں نے کیں

وہ آج بھی روشن ہیں

میری لکھی اولین کہانی.......جو غیر ریاستی میگزین میں شائع ہوئی تھی

سرسری نظروں سے پڑھ کر کہا...... ''لکھنا ہے تو کچھ ایسا لکھو''

پھر ــــــ عید گاہ....کہانی سنائی

میں حیران ہوں کہ میں نے اس قسم کی چیزیں پڑھتے ہوئے اُنہیں کبھی دیکھا نہ تھا........!

ایک نظر

ریاست کے جانے پہچانے افسانہ نگار مشتاق مہدؔی کے افسانوی مجموعے ''آنگن میں وہ'' پڑھ کر مجھے یہ طمانیت بخش احساس ہوا کہ اُن کے افسانے روایتی اور سکہ بند افسانوی آداب سے ایک حد تک احتراز کر کے افسانے اور افسانوی تجربے کے مطابق افسانوی تکنیک کو برتتے ہیں۔ اُن کے لئے یہ اختراعی روّیہ برتنا اور اِسے جاری رکھنا آسان نہ تھا۔ ذرا بھی لاپرواہی یا غفلت سے افسانہ، انشائیہ بن کر رہ جاتا یا ''ادب لطیف'' کا کوئی مسترد کردہ نمونہ قرار پاتا۔ اِن کے بیشتر افسانے فن کے پُل صراط سے گزرتے ہیں۔

اس امر کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ ان کے افسانوں میں متکلم یا بیان کُنندہ بھی ہے، واقعات بھی ہیں، فضا آفرینی بھی ہے، اور افسانوی تجربہ کی نمود وارتقا بھی ہے۔ ماقبل کے ادوار میں ان میں تبدیلی اور ترمیم کو بھی روا رکھا گیا تجریدی اور علامتی افسانے لکھے گئے..... مشتاق مہدی نے بھی اپنے خاص خودمرتکز لسانی اظہار میں علامتی اسلوب کو روا رکھا۔ اُن کے افسانوں میں ان کی انفرادئیت، تاثر پذیری اور شعور کی رَو سے بھی استفادہ کرنے کا میلان نظر آتا ہے۔

مشتاق مہدیؔ کے افسانوں میں بیان کنندہ ایک عاید کردہ کردار نہیں۔ وہ مصنف کی گرفت سے نکل کر افسانے کے تخئیلی ماحول میں تداخل کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اس کے برعکس وہ افسانے کی فرضی دنیا کا زائدہ اور پرداختہ کردار ہے۔ وہ افسانوی دنیا میں اپنے فائدے کی باریکی، نفسیاتی کوائف اور فضاسازی میں کسی گراں باری سے نہیں بلکہ برجستگی سے نمو پزیر ہوتے ہیں یعنی اپنے اسلوبِ گفتار اور عمل اور ردعمل کو مربوط، رواں اور منضبط ارتقائی صورت میں پیش ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے تجربات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں سریلی انداز میں رمز دے کر ہی اُبھارتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کے افسانے پامال شُدہ حقیقت نگاری کی نذر نہیں ہوتے۔

مشتاق مہدیؔ کے افسانوں کے تجربے جدید انسان کی جبلت، خواہشات، خوابوں کی شکست، تضادات اور امید والتباس کا احساس دلاتے ہیں مگر بقول علامہ اقبال ؂

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی

اُن کے منتظر ہیں

پروفیسر حامدی کاشمیری

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی بات

1974ء میں میری پہلی کہانی ــــ ''کمینہ'' بمبئی فلم سنسار میں شائع ہوگئی۔ تب سے آج تک قریب پانچ درجن کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں بیشتر کہانیاں مختلف جریدوں میں شائع ہو چکی ہیں۔

ہم سبھی جانتے ہیں قدیم انسان کے پاس احساسات کی ترجمانی کیلئے نہ تو الفاظ تھے اور نہ کسی زبان کا کوئی چلن تھا۔ اُسکے پاس صرف اشارے تھے، اُنگلیوں، آنکھوں اور اوزاروں کے اشارے۔ پھر ایک لمبا عرصہ گُزرنے کے بعد زبان وجود میں آگئی، اُس نے بولنا شروع کیا۔ پھر اُس نے لکھنے پڑھنے کے ہنر میں بھی مہارت حاصل کی، چونکہ مختلف فنون کے ساتھ ایک دلچسپی بھی اُس کی سرشت میں تھی۔ پھر پتہ نہیں کب اُس نے شعر کہنا شروع کیا اور قصے کہانیاں وغیرہ تحریر کیں۔

کیونکہ حیات کا تقاضا ہی تبدیلی ہے انسان کے ارتقائی سفر کے ساتھ کہانی کے بیان میں بھی تبدیلی آنی لازمی تھی، سو آگئی، کئی اسلوب وجود پا گئے

داستانی اسلوب... علامتی طلسمات کا اسلوب... حقیقت نگاری کا اسلوب... تجریدی اسلوب... مکالماتی اسلوب، شعور کی رَو کی تکنیک... انٹی سٹوری

ٹریٹمنٹ وغیرہ........

اسلوب بہر حال کوئی بھی ہو افسانے میں کہانی پن کا ہونا زندہ آدمی میں سانس کی طرح لازمی اور ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہانی کہنے (لکھنے) کا کوئی بھی اسلوب حتمی اور آخری نہیں ہے۔

میں کیوں لکھتا ہوں.....

اِس سوال کے جواب میں عرض ہے۔ زندگی اور حُسن کا ہمیشہ سے قدر دان رہا ہوں۔ بہت محبت کی ہے زندگی سے... ایسا لگتا ہے میرے لاشعور میں چھپی اُسی ایک موج کا اظہار ہیں یہ کہانیاں.......

یہ جیون کیا ہے.....؟

ایک خواب ....ایک کھیل ..... ایک امتحان.....ایک تلاش یا ــــ آسان نہیں ہے میرے لئے زندگی کو کوئی خاص ایک نام بخشنا۔

بہر حال آدمی زندگی کو بھوگتا ہے.......غم، خوشی، ماتم، وغیرہ سہتا ہے... ست رنگی منظر نامے کا حصہ بنتا ہے.....زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ــــ یہی سب کچھ آدمی ہے.....میں ہوں...میری کہانیاں ہیں....!

طالبِ حق

مشتاق مہدیؔ

13-6-2009

کہانیاں

☆☆☆ ___________________________

☆☆☆ میرے افسانوی کرداروں سے..... یا اُن کے ناموں سے کسی بھی قسم کی کوئی مطابقت اتفاقیہ ہوسکتی ہے۔ جس کے لئے مصنف اور ناشر پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوسکتی۔☆☆☆

رنگ

دھوپ اُس روز دھرتی پر مہربان تھی....

ہوا میں خنکی تھی اور نئے موسم کی تازگی بھی... کھڑکی کے راستے قریب آ کر گویا ہوئی...

آ و......آ و باہر...اور دیکھو رنگ رنگ کے......

رنگ...رنگ کے...؟

ہاں۔ رنگ رنگ کے... کہ رنگ رنگ جدا، کہاں تک ایک ہیں اور عالیہ بھی اب اپنی مکتی چاہتی ہے۔ اور تو بھی بے قرار ہی ہے کہ دیکھیں تماشائے رنگ....

تو کیا یہ سارا سلسلہ رنگ کا ہی ہے۔؟

وقت ساری باتیں ایک ساتھ نہیں کہتا... کہ کچھ کل کے لئے بھی راز رہنا چاہئے ورنہ کل ــــــ بے سانس ہو کر مر جائے گا

پھر وہ باہر نکل آیا

اور چار پاؤں سے اُس کی دوڑ شروع ہو گئی۔ پھر وہ دو پاؤں سے چلنے لگا اور رنگ رنگ اپنے اندر اُتار کے...وہ ایک اور رنگ کی تخلیق میں کھو گیا۔

''سنو....'' ایک سرگوشی ہوئی ''ان بچوں کے ساتھ کھیلا نہ کرو....

.....یہ کھیل اچھے نہیں ہیں اور نہ یہ بچے ہی.....''

'مگر بابا جان ـــــ' ایک خاموش جواب 'مجھے تو یہ کھیل بھی اچھے لگتے ہیں اور یہ بچے بھی....'

''تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا...''

''جی میں ۔۔۔ اُن کے ساتھ نہیں کھیلونگا....''

''اور اگر پھر کھیلا تو..........''

ایک موٹی چھڑی اُس کے سامنے لہرا دی گئی۔ وہ سہم سا گیا۔ ڈر گیا۔ نظریں چراتے ہوئے سوچنے لگا ـــــ رنگ، رنگ کے یہی ہیں اور اتنے وحشت زدہ......تو پھر آگے.....!

کل کے کھیل کوئی نہیں جانتا کہ کل....کل ہے...مگر آج تو اُس کل کی ایک سیڑھی...ایک ضمانت....ایک امکان ہے...تو پھر کیوں نہ آج ہی اُس کل کا کوئی نغمہ چھیڑا جائے ـــــ مگر کس کے سامنے....؟ سُننے والا کون ہے....؟

اور کہاں ہے....؟

چھوٹے بچے کی آنکھوں میں، سوچوں میں ایک سوال سا لہرایا ـــــ ایک

معصوم سوال... ایک پیاس... ایک تلاش... ایک کہانی شروع ہوگئی

عالیہ نے اپنی کہانی، اپنے رنگ میں جاری رکھی

اور اگر یہ بھی نہ ہوتی... تو واقعی جہنم اور کچھ نہ ہوتا۔

وہ بادلوں کو دیکھتا... چھپی چھپی نظروں سے آکے برس جاتے تھے۔ سورجوں کو دیکھتا... آکے ڈوب جاتے تھے... قدموں کو دیکھتا... تھک کے رک جاتے تھے۔

اور پھر... اذانیں... آوازیں

بے شمار... چاروں طرف

وہ دوڑنے لگتا... ہانپتا۔ رُکتا... پھر دوڑیں لگانے لگتا... کتنی صدیوں کا یہ سفر ہے رنگ کا ـــــ کون جانے....؟ اور فرصت بھی کسے ہے کہ سوچے....

آگے تو اگلے لمحے پہ ایک سوال منتظر ہے، دھڑکنوں کا ـــــ اس کا جواب ڈھونڈیں کہ ماضی میں کھو جائیں.... تب اُسے کھونا پسند نہیں تھا.. اور کیسے ہوتا... بے شمار کہانیاں تو سامنے بکھری پڑی تھیں...

''آو... آو میرے پاس۔''

اُس عورت نے اپنی بانہیں پھیلائیں۔ پیار سے اپنے پاس بُلایا ـــــ

نوخیز لڑکا شرما گیا

ڈر سا گیا ـــــ اپنے آپ کو چھپانے لگا۔ جیسے اُسے معلوم تھا۔ ان ہاتھوں کی حرکت کے پیچھے کیا ہے....؟

تب اُسے کس نے کہا تھا۔ یہ عورت راتوں کو اکیلی ڈرتی ہے.... کہ ہانگ کانگ گیا ہوا اُس کا خاوند۔ دوسری شادی رچا گیا ہے وہاں... اور سرد راتوں میں اکیلی جوان عورت اور ٹھنڈ.......

اب کون اُس کے گھر سونے کے لئے جائیگا

میں ـــــ میں تو نہیں۔ اُس نے انکار کیا۔ اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلا آیا اور دیر تک سوچتا رہا کہ اقرار کے معنی کیا ہوتے......!

اگلے دن سکول جانے کو جی نہ چاہا

گھر سے تو سکول کے لئے نکلتا ہے مگر قدم خود بخود ایک پارک کی جانب چل پڑتے ہیں۔ کتابوں کا بستہ اُسکے کندھوں پر ہے اور جیب میں باپ کی جیب سے چُرایا ہوا ایک روپے کا نوٹ۔

چور ـــــ وہ چور نہیں ہے

مگر یہ تو اُس نے باپ کی جیب سے چرایا ہے

تو پھر اسلم بھی چور ہے اور اشرف بھی... جنکی جیب میں ہر وقت بہت سے روپے ہوتے ہیں

اشرف تاش کھیلتا ہے، میں بھی کھیلوں گا۔

مگر یہ تو جُوا ہے... بُرا ہے

اشرف کے لئے کیوں بُرا نہیں... اور اسلم بھی تو...

راتیں خاموش اپنی کہانیاں کہتی سناتی ہیں۔ یکا یک ہی اُسکے اندر ایک

عجیب قسم کی بیزاری پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی گلی سے... اپنی گلی کے یاروں سے

کیا یاروں نے اُس کی سُنی نہ تھی

ہاں سُنی نہ تھی

کیا یاروں نے پتھر اُٹھائے تھے..

ہاں پتھر اُٹھائے تھے اور دکھائی تھیں سُرخ آنکھیں

وہ بھی تو دکھا سکتا تھا

یہ سب کچھ اُسے پسند نہیں.. اُسے کیا پسند ہے وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا۔

یہ سُن کے خوش ہوتا ہے کہ باپ نے اپنا آبائی مکان بیچ ڈالنے کا فیصلہ کیا ہے اور چند ہی دنوں میں اب اس گلی سے نجات ملنے والی ہے۔

پھر ایک روز نجات مل ہی گئی

اُسکے ہمسائے دوست سبھی رو رہے تھے لیکن وہ خوش تھا۔ اندر ہی اندر بہت مسرور... ایک گلی میں وہ گھٹ کے مر جائے گا۔ تبدیلی ضروری ہے۔ ایک اور گلی۔ ایک اور کہانی..... ایک اور نشان........

اور نئی گلی کے نئے رنگوں سے وہ یوں پلٹ گیا کہ جیسے یہی رنگ تھے۔ یہی گلی تھی کہ جس کے لئے وہ بے قرار سا تھا۔

سورج ٹھہرے کب تھے.. جو ٹھہرتے... موسم بدلتے رہے اور وہ... وقت کی موجوں میں بہتا رہا... چلتا رہا... گیت غم ناک.. اپنی تنہائیوں میں گاتا رہا

یار کوئی نغمہ سناؤ

اور وہ کھو جاتا ئسر کی گہرائیوں میں...

یار کوئی گیند اُچھالو

اور دیکھنے والے حیران رہ جاتے

یار... تُو تو غضب کا کھلاڑی ہے

وہ خاموش رہتا۔ شرما جاتا... کیسے کہتا... غضب کی سرحدیں تو دور بہت دور ہیں..... میں جانتا ہوں، کہاں ہیں..؟

اور پھر آنکھ کھلنے تک اُسے لگا... کہ وہ سب کچھ ایک خواب تھا۔

○

جاگنے کے بعد اُس نے ہوائیں سونگھیں.... مہک رہی تھیں... دھوپ کی دھڑکنوں کو چُھوا.. بول رہی تھیں.. خشک تالابوں کے قریب جا کے دیکھا____ پیاس پیاس کر رہے تھے۔ مر رہے تھے۔

پھر اُس نے داستان سے داستان ملا کر اذان دی.... میں سمندر ہوں... سات... تم سبھوں کے لئے... کہ دیوتا مجھ سے ہمکلام ہوا ہے کہ جیسے اگلے لوگوں سے ہم کلام ہوا تھا.. کہ جیسے بعد کے لوگوں سے ہمکلام ہوگا... دیوتا ہم سب پر ہی مہربان ہے۔

[illegible] خوشگوار قسم کی تبدیلی پیدا کی تھی____ وہ اب ہنسنے بولنے لگا تھا۔ پھول کو چومنے لگا۔ دیوانہ وار پیار کرنے لگا۔ اپنے بیگانے سبھوں سے...

'یہ وہ نہیں ہے، جو کل تھا'

ہوائیں کہتیں...

وہ مسکرا کر جواب دیتا

''میں وہی ہوں، جو کل تھا —— مگر آج... آج ہے.. آخر پچیس پتوں کا کھیل تو یوں ہی نہیں تھا۔ یہ میرے ہاتھ میں چھبیسواں پتہ ہے...''

اور ستائیسویں پتے کو پھینٹتے ہوئے اُس نے کئی پسند کی ہوئی چیزیں ناپسند کیں۔

مثلاً... شاعری

'یہ تو ایک کہانی ہے، دھڑکنوں کی۔ ایک نغمہ ہے روح کا'

'ہاں —— مگر مایوسی اور دھند کار بھی پھیلا دیتی ہے —— جو مجھے پسند نہیں'

'تمہیں کیا پسند ہے....؟'

'مجھے... مجھے تو...'

وہ کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے۔ اچانک ڈوب سا جاتا ہے، اندر ہی اندر دور کہیں....

'وہاں کیا ہے...؟'

'روشنی... نور.... نور کے دریا...'

'مگر اندھیرا ابھی تو'

'ہاں سائے کی طرح روشنی کے ساتھ... مگر روشنی تو پھر بھی روشنی ہے، اندھیرے کو چیر کے باہر نکل آتی ہے اور جہاں جہاں خاموشی ہے وہاں پر ایک چیخ اُبھرے گی۔ ایک فلک شگاف آواز گونجے گی.... ہر طرف... ایک روز.... دیکھ لینا تم....'

'تب تک تو ہم مٹی ہو چکے ہونگے'

'تمہارے بچے بھی تو تمہارے ہی چہرے ہیں'

'ہیں۔ لیکن میں اپنی بات کر رہا ہوں'

'ہر کوئی اپنی ہی بات کر رہا ہے'

'کوئی کوئی تو خاموش بھی ہوتا ہے'

'وہ اپنے کھوئے ہوئے اظہار کی تلاش میں ہوتا ہے'

'تمہارا مطلب ہے....'

'میرا مطلب ہے، عالیہ اُداس ہے۔ اُس کی تمام سنتان غم زدہ ہے۔ اُس کی کوکھ کے سارے پھول بکھر چکے ہیں۔ جل چکے ہیں..... اور رنگ کا سوال بھی ادھورا ہی رہا۔ تم اُسکی تشریح نہ کر سکے۔ اس کو جان نہ سکے'

'ہاں ــــــ مجھے افسوس ہے!'

☆☆☆

بزدل

رات بھیگ رہی تھی

مسز رحمان کی کوٹھی کا وسیع ہال مہمانوں سے جگمگا رہا تھا۔ یہ جگمگاہٹ رنگین لباسوں کی تھی۔ فلک شگاف قہقہوں کی تھی۔ رقص و سرور کی تھی۔ بھرے ہوئے جاموں کی تھی --- ڈنر کے بعد رقص کے شائقین ایک پیاری سی مغربی دھن پر ناچنے لگے۔ کچھ مہمان پینے لگے اور کچھ پی کر لڑکھڑانے لگے تھے۔ جہانگیر... مسز رحمان کی فرم کا جنرل منیجر دو پیگ چڑھا چکا تھا۔ تیسری پیگ کی لہر میں اچانک اپنی کرسی سے کھڑا ہو گیا اور جھومتا ہوا سامنے والی میز کے قریب جا کر بیٹھے نوجوان سے مخاطب ہو کر بولا

''ہیلو ڈاکٹر...'

''ہیلو....'' ڈاکٹر اسلم نے بے دلی سے جواب دیا جیسے جہانگیر کا اس طرح پکارنا اُسے پسند نہ آیا ہو۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ اتنے میں سرو serve کرنے والے ملازم نے جہانگیر کے اشارے پر ٹیبل پر وسکی، سوڈا اور دو عدد گلاس رکھ دیئے۔ جہانگیر نے دو جام بنائے۔ ایک جام ڈاکٹر اسلم کی طرف سرکاتے ہوئے کہا

''مسز رحمان بڑی زندہ دل عورت ہے۔ جی چاہتا ہے روز اُس کی سالگرہ ہوا کرے اور میں جام بھرتا رہوں۔ خیر لیجئے --- جام نوش کیجئے...''

''شکریہ...میں پیتا نہیں۔''

''کیا کہا ـــــ!'' جہانگیر نے بے اعتباری سے پلکیں جھپکیں۔ایک ہی گھونٹ میں آدھا گلاس حلق سے نیچے اُتار کر ہونٹ پونچھتا ہوا بولا ''مگر یہ کیسے ہوسکتا ہے۔؟''

''کیوں ـــــ'' ڈاکٹر اسلم اُس کی حیرانگی پر مسکرایا'' کیا میں نے کوئی انہونی بات کی''

''انہونی تو نہیں'' جہانگیر جلدی سے بولا'' پھر بھی مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔جس شخص کی بیوی ایک دن بھی شراب پیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ خود پیتا نہ ہو..strange...بات کچھ عجیب سی لگتی ہے...''

کہکر وہ ہنس پڑا۔ کچھ دیر ہنستا رہا.... ہنسی تلخ اور طنز آمیز تھی۔خون خشک کر دینے والی ہنسی تھی۔ اسلم کے جی میں آیا۔ جہانگیر کا منہ نوچ لے۔ اس ہنسی کا گلا گھونٹ دے۔مگر کیسے ـــــ؟ ہنسنا انسان کا پیدائشی حق ہے۔ وہ کس کس کو ہنسنے سے بازِ رکھ سکتا ہے۔کس کس کا گلا گھونٹ سکتا تھا۔کس کس کا منہ بند کرسکتا تھا۔کسی ایک کا بھی نہیں.....سوچیں طویل ہوتی جارہی تھیں۔ ان سوچوں میں گھٹن تھی۔ ایک گھناونا احساس تھا، ایک تلخی تھی۔ڈاکٹری نکتہ نگاہ کو سامنے رکھتے ہوئے اُس نے مزید سوچنا مناسب نہ سمجھا۔اپنا دھیان اپنی سوچیں منتشر کرنے کے لئے وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا

جہانگیر اُٹھ کر چلا گیا تھا

مہمان بدستور خوشی میں ڈوبے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ کچھ مہمان پی رہے تھے، کچھ باتوں میں مصروف تھے اور کچھ... رقص کرنے والے مہمان رقص کے نام پر اپنے تشنہ جذبوں کو سہلا رہے تھے۔ اُسکی بیوی کا پارٹنر بیس اکیس سال کا ایک سجیلا خوبرو نوجوان منظور تھا۔ منظور بار بار زرینہ کی گردن کے بڑے سے تِل کو چومنے کی جدوجہد کر رہا تھا اور زرینہ نوجوان کی اس حرکت پر مسکرا کر گردن جھٹک دیتی تھی۔ یہ ادا خوبصورت تھی۔ رات اور روشنیاں خوبصورت تھیں... یہ رقص خوبصورت تھا... ماحول اور محفل خوبصورت تھی... لیکن ڈاکٹر اسلم کے لئے یہ سب کچھ بے کیف تھا۔ وہ بار بار بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا، پھر دوسرے ہی لمحے اُٹھ کے کھڑکی کے قریب آ گیا۔

تاروں بھری چاندنی رات کسی شوخ الہڑ دوشیزہ کی طرح مسکرا رہی تھی مگر اُسے ایسا محسوس ہوا۔ رات کی مسکراہٹ مصنوعی ہے۔ رات اصل میں سسک رہی ہے اور چاند کھلا نہیں ہے بلکہ اس کی پیلی پیلی روشنی سولی پہ چڑھے ہوئے انسان کی آنکھوں کی وہ ڈوبتی کانپتی چمک ہے کہ جس سے وہ اگلے ہی پل محروم ہونے والا ہے... یکبارگی اُسکی سوچوں میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا، اُس کی آنکھیں یادوں کے دھندلکے میں ڈوب گئیں....

''سیٹھ احسن کو جانتے ہو اسلم۔ وہ اپنی بیٹی کا رشتہ مانگنے آئے تھے...''

''جی......'' اسلم بری طرح چونکا، بے اعتباری سے بولا ''یہ کیسے ممکن ہے۔ کہاں وہ شہر کے رئیس اور کہاں ہم ـــــ مجھے تو.....!''

''تم بیوقوف ہو ـــــ'' بوڑھا باپ اپنی بے نور چھوٹی چھوٹی آنکھیں موند کر بولا'' وہ اگر سیٹھ ہے تو ہم کیا کم ہیں.. مانا کہ غریب ہیں۔ لیکن تم اب ڈاکٹر بن گئے ہو، تمہاری عزت ہے۔ ایک قیمت ہے، جانتے ہو جہیز کیا ملے گا ــــ پانچ لاکھ روپے نقد.... کار اور ساتھ میں کوٹھی....''

اسلم کی انکھیں ایک لمحے کے لئے چندھیا سی گئیں

کوٹھی... کار... اور روپیہ ــــ سوسائٹی میں ایک خاص مقام پانے کا ذریعہ.... گھر کی پراگندگی دور کرنے کا ایک وسیلہ... آخر کس لالچ میں سیٹھ احسن اتنا جہیز اور لڑکی دے رہا ہے۔ لڑکی تو ٹھیک ہے نا... لنگڑی تو نہیں... کانی تو نہیں.... کہیں ایسی ویسی کوئی بات تو نہیں... اُسکے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''ابا جان وہ لڑکی......''

بوڑھے کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ مسرت آمیز لہجے میں بولا ــــ ''میں نے دیکھی ہے۔ اپسرا ہے اپسرا۔ کالج میں پڑھتی ہے۔ پرسوں خود اُسے دیکھنا تم...''

سیٹھ احسن کی بیٹی واقعی اپسرا تھی۔ ڈاکٹر اسلم نے دیکھتے ہی حامی بھر لی۔ زرینہ نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا اور بات پکی ہوگئی۔

پھر دونوں کی دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ شادی کے ہفتہ بھر بعد وہ دونوں سیر تفریح کے خیال سے گلمرگ چلے گئے۔ قریب ایک ماہ بعد وہاں سے گھر لوٹے تو دونوں خوش تھے۔ ایک دوسرے سے مطمئن تھے کہ لمحے جوانی کے تھے، کیف آور اور نشہ باز۔!

دن حسین اور راتیں رنگین تھیں...

مگر کچھ ہی عرصہ بعد ڈاکٹر اسلم ایک خیال سے چونک اُٹھا۔ اُسے احساس ہو گیا کہ شادی صرف اُس کی اپنی خوشی نہ تھی۔ اس شادی کے ساتھ گھر والوں کی بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ وہ امیدیں کیا ہوئیں۔ وہ خوش بخت خواب کیا ہوئے... باپ، بھائی اور چہیتی بھابھی کے دن کیوں نہ پھر سکے۔ بھائی کے چھوٹے بچے اب بھی کیوں پھٹے پرانے کپڑوں میں نظر آتے ہیں.... یہ ماحول.. یہ گھٹن سی کیا ہے ---؟ نچلے طبقے کی پیداوار... اس پیداوار کو تبدیل کرنے کے لئے کافی روپیوں کی ضرورت تھی۔ مگر روپیہ اُس کی اپنی تحویل میں نہ تھا، زرینہ کے بنک لاکر میں محفوظ تھا... زرینہ انجان بنی، اپنی ہی دھن میں کھوئی رہی.. اسلم خود میں اتنی ہمت جٹا نہ پا رہا تھا کہ زرینہ سے دوٹوک کچھ کہے، کوئی موٹی رقم مانگ لے کہ جس سے گھر کی گھٹن آلود پریشان حالی کا کچھ سد باب ہو سکے۔ ایک شام اسلم ڈیوٹی سے لوٹا تو زرینہ نے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہ کیا۔ منہ پُھلائے بیٹھی رہی

اسلم نے قریب جا کر بڑے پیار سے پوچھا

''زرینہ ___ کیا بات ہے۔؟''

زرینہ جیسے پھٹ پڑی۔ چلاّ کر بولی

''اب میں اس گھر میں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ آپ کا باپ مجھے کوستا رہتا ہے اور بھابھی مجھے طعنے دیتی رہتی ہے۔ دن بھر مجھ سے لڑتی جھگڑتی ہے یہاں... یہاں.. میرا دم گھٹ جائے گا، آپ چاہتے ہیں کہ میں....!''

اسلم نے اُسکے ہونٹوں پر جلدی سے اپنی اُنگلی رکھ دی۔ بڑی محبت سے کہہ اُٹھا...

''تم کہو... میری جان اب کرنا کیا ہے۔؟''

زرینہ جیسے اسی فقرے کی منتظر تھی. فوراً کہہ اُٹھی

''کنگس کالونی میں ہماری نئ کوٹھی تیار ہو چکی ہے۔ ہم وہیں چلے جائینگے...''

'' مگر... زرینہ....''

''اگر مگر کچھ نہیں... ہم پرسوں چلے جائینگے'' زرینہ نے تحکمانہ انداز میں کہا

اسلم نے خاموشی اختیار کی... اپنی خوبصورت بیوی کو وہ اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ زرینہ کی بات ٹالنا یا اُسے ناراض کرنا اُس کے اختیار میں نہ تھا۔ تیسرے ہی دن گھر والوں سے علاحدگی اختیار کر کے نئ کوٹھی میں چلا گیا۔ نئ کوٹھی میں جانے کے دو ہی ماہ بعد ایک خوبصورت بیٹی کا باپ بن گیا۔ خوشی دوہری ہوگئ ____ میاں بیوی نے متفقہ طور فیصلہ کیا کہ ایک شاندار پارٹی دینی چاہئے...

اتفاق سے جس دن پارٹی تھی اُسی دن اُسکا بوڑھا باپ، بھائی اور ماں سے زیادہ چاہنے والی بھابھی... تینوں اسلم کی ننھی سی بیٹی کو دیکھنے کے لئے آ گئے تھے۔ اسلم بڑے گھر کا داماد تھا۔ بڑا آدمی بن گیا تھا۔ اپنوں کو بھول بیٹھا تھا مگر اپنے اُسے کیسے بھول سکتے تھے، بڑی اُمیدوں کے ساتھ پالا جو تھا۔ تینوں ڈرتے، جھجکتے، کچھ سہمے ہوئے سے ڈرائینگ روم میں داخل ہو گئے ____ اسلم کی نظریں اُن پر پڑیں

تو کچھ خوش بھی ہوا اور حیران بھی...ایک جذباتی مسکراہٹ ہونٹوں پر لئے اُنکی طرف چل دیا لیکن دو ہی قدم چلنے کے بعد اُسکے پاؤں ٹھٹھک گئے۔ایک مہمان عورت زرینہ سے پوچھ بیٹھی...

''یہ تھرڈ کلاس لوگ کہاں سے آگئے۔کیا تم نے ایسے لوگوں کو بھی مدعو کیا ہے...؟''

زرینہ نے کوئی جواب نہ دیا۔سوال کرنے والی سہیلی کو ٹالنے کے لئے ہلکا سا قہقہہ لگا دیا۔مہمان عورت نے بھی کچھ نہ سمجھتے ہوئے جوابی قہقہہ لگا دیا...پھر اچانک دوسری میز کے قریب بیٹھے ہوئے جوڑے نے بھی ایک قہقہہ لگا دیا..یہ قہقہے اونچی سوسائٹی کے تھے اور قہقہے کا مضمون اسی سوسائٹی کے ایک فرد کا باپ تھا۔اسلم کا بوڑھا چپراسی باپ..مریل اور کمزور سا کلرک بھائی اور صاف وشفاف لیکن کم قیمت کے کپڑوں میں ملبوس سوکھی سمٹی ہوئی بھابھی...

تینوں اپنا سا منہ لیکر تھکے ہارے قدموں کے ساتھ واپس لوٹنے لگے۔اسلم چاہتے ہوئے بھی اُنہیں نہ روک سکا۔خاموشی سے اُنہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا...
کافی رات گئے پارٹی اختتام کو پہنچ گئی۔

بیڈروم میں آکر زرینہ نے اسلم کے اُداس، اُترے ہوئے چہرے کو لمحہ بھر غور سے دیکھا پھر پوچھا...

''کیا بات ہے۔آپ کی طبعیت تو ٹھیک ہے''

اسلم نے گھور کر اُسے دیکھا اور تلخی سے کہا

’’ بھری محفل میں میرے گھر والوں کی بے عزتی کرائی... اور کہتی ہو کہ طبعیت تو ٹھیک ہے...!‘‘

زرینہ آہستہ سے چونکی۔ اسلم کے چہرے کی سختی بھانپ کر الفاظ تلاشنے لگی

’’ آپ ہی کہیے۔ ہم نے کیا اُنہیں مدعو کیا تھا۔ وہ یہاں بن بلائے کیوں آ گئے تھے... کیا ہمارا انداق اُڑانے کے لئے آ گئے تھے؟‘‘

’’ زرینہ ـــــ‘‘ اسلم کی آواز میں تلخی اور ترشی صاف جھلکنے لگی...

’’ وہ ہم سے ملنے آ گئے تھے۔ ہماری بچی کو دیکھنے کے لئے آ گئے تھے... تم جانتی ہو۔ میرا اُن کے ساتھ ایک رشتہ ہے‘‘

’’ رشتہ ـــــ‘‘ زرینہ مسکرا دی... ایک ایک لفظ زور دیکر بولی ’’ تھا اب نہیں ہے‘‘

’’ کہ... کیا مطلب...؟‘‘ اسلم چکرا سا گیا۔ چونکتی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ کچھ دیر بعد زرینہ بیڈ پر آ کر سو گئی۔ اسلم اُس رات سو نہ سکا۔ تمام رات کروٹیں بدلتا رہا۔ سوچتا رہا.. فیصلے کرتا رہا۔

لیکن اگلی صبح وہ عام دنوں کی طرح خاموش اور نارمل دکھائی دیا جیسے کل کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ دراصل یہ سوچ کر اُس نے چپ سادھ لی تھی کہ زرینہ ناسمجھ نہیں، ایک پڑھی لکھی سوچنے والی عورت ہے۔ کل پرسوں تک اپنی غلطی کا احساس کر کے شرمندہ ہو جائے گی۔ معافی مانگ لے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ زرینہ کے رویے میں

مزید تلخی اور بے رخی نمودار ہوگئی۔ ماحول میں گھٹن اور تلخیاں بڑھنے لگیں ــــ ڈاکٹر اسلم سوچ سوچ کے جھلا اُٹھتا.... کہ اُسکی بیوی کے اندر کیالاوا پک رہا ہے۔ وہ کیوں اتنی بدلی بدلی سی نظر آرہی ہے ــــ وہ اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔ آخر وہ مرد ہے۔ اپنی بیوی پر اُس کے کچھ اختیارات ہیں۔ وہ اپنی بیوی کو سمجھا سکتا ہے۔ شراب پینے سے باز رکھ سکتا ہے۔ پارٹیوں میں جانے پر پابندی لگا سکتا ہے ــــ لیکن نہیں۔ اُس کے اختیار میں کچھ بھی نہ تھا۔ وہ زرینہ پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ بُزدل تھا۔ اُس سوسائٹی کا فرد تھا جہاں ایسے معاملوں پر لب کشائی معیوب خیال کی جاتی ہے۔ اُسے ڈر تھا۔ زرینہ یہ نہ سوچے اُس کا شوہر قدامت پسند ہے۔ تنگ نظر ہے۔ اونچی سوسائٹی کے آداب سے ناواقف ہے۔ اُسے خیال آگیا... کیا واقعی وہ اس سوسائٹی کے قابل نہیں یا سوسائٹی کے نام پر اُسے ذلیل کیا جارہا ہے۔ ہنسی مذاق کا نشانہ بنایا جارہا ہے...

مگر کیوں...... اُس کا قصور کیا ہے۔ کیا یہی کہ وہ اپنی بیوی کو جی جان سے زیادہ چاہتا ہے۔ جسکے لئے اُسنے اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا۔ اپنی نظروں میں خود کو گرا دیا۔ آخر کیا بات ہے۔ زرینہ کیوں اتنی بدل سی گئی ہے۔ کیا راز ہے......؟ اُس نے جب بھی بات کی تہہ تک پہونچنے کی کوشش کی۔ اُس پر جھنجھلاہٹ سوار ہو جاتی... وہ خود کو بے بس سا محسوس کرتا۔

"اسلم صاحب.... آپ سو گئے..." ایک آواز اُسکے کانوں سے ٹکرائی

"نن.... نہیں تو..." اسلم نے چونک کر جواب دیا۔ سوچتے سوچتے کافی

وقت گزر چکا تھا۔ پارٹی اختتام پر پہنچ گئی تھی۔ مہمان مسز رحمان سے رخصت لے کر جا رہے تھے... جہانگیر قریب ہی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کچھ لمحے بعد اُس نے اپنی مخصوص طنز آمیز آواز میں کہا

"ڈاکٹر اسلم.. اِدھر کیا دیکھ رہے ہیں آپ۔ اُدھر اُس کونے میں آپکی بیگم بے ہوش پڑی ہے۔ اُٹھیے... اُنہیں سنبھالئے...."

اسلم کی نظریں تیزی سے بے ہوش زرینہ کی طرف اُٹھ گئیں۔ وہ فرش پر بے سُدھ پڑی ہوئی تھی۔ اُس کا نصف چہرہ کالے گھنے بالوں کے پیچھے چُھپ گیا تھا اور نصف چہرہ قمقموں کی روشنی میں چمک رہا تھا____ کئی بھوکی نظریں اُس پر جمی ہوئی تھیں۔ اسلم کے اندر آگ سی لگ گئی پر منہ سے وہ کچھ بولا نہیں... تیزی سے اُٹھ کر زرینہ کے قریب آگیا۔ اپنی نیم بے ہوش بیوی کو سہارا دے کر کھڑا کیا ____ نرمی سے کہا "...چلو...."

زرینہ تھوڑا سا لڑکھڑائی۔ مگر چل پڑی اُس کے ساتھ ____ ابھی چند ہی قدم اُٹھائے تھے کہ پیچھے سے ایک دبی دبی ہنسی سُنائی دی

زرینہ تھوڑا سا چونکی

ڈاکٹر اسلم غصے سے تلملا اُٹھا... اُس کے جی میں آیا۔ وہ پلٹ جائے۔ اور منہ میں بھرا ہوا سارا جاگ اُن سب پر تھوکے اور کہے... میں سو بار تھوکتا ہوں۔ تمہاری اس سوسائٹی کے طور طریقوں پر

لیکن اُسے تھوک نگلنی پڑی ____ ایسا وہ کر نہ سکا ☆☆☆

تخلیق کے آنسو

مغرب کی ہوائیں تیز اور طوفانی تھیں۔

ان ہواؤں کا زور شدید تھا۔ پتے کانپ رہے تھے۔ درخت اُکھڑ رہے تھے مکانوں کی چھتیں اُڑ رہی تھیں... پھر یکا یک ہی پہاڑ کی اونچی چوٹی کا پتھر اِن ہواؤں کی زد میں آ گیا۔ اپنی جگہ سے ہل گیا۔ پھر سنبھل نہ سکا اور دوسرے ہی لمحے نیچے پستیوں کی جانب ڈوبتا چلا گیا ـــــ نیچے کوئی گہری کھائی نہ تھی۔ شہر کی ایک بارونق، بھری پُری سڑک تھی۔ لڑھکتا ہوا اسی سڑک پر آ پہنچا۔ یہ بے رنگ و بو... بے جان... بے حس پتھر۔

یہ پتھر..... راہ چلتے ہوئے انسانوں کے لئے ایک تماشا بن گیا۔ لاتعداد ٹھوکروں نے اس پتھر کے نوک دار حلیے کو بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ یہ پتھر ایک ہیبت ناک تصور بن گیا تھا... جو بھی نظر بھر اس پتھر کو دیکھتا۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے لیکن پھر خاموشی سے آگے اپنی منزل کی سمت بڑھ جاتے۔ اس ایٹمی دور میں اتنی

فرصت کہاں کہ آدمی بے جان پتھروں پر غور کرے۔ کسی کا ہمدرد بنتا پھرے....

راہ چلتے ہوئے جب بھی یہ پتھر اُسکے چمکیلے بوٹ کی نوک کے سامنے آجاتا تو ایک لمحے کے لئے وہ سوچنے لگتا ـــــ یہ پتھر کیوں یہاں پڑا ہے....؟ لیکن دوسرے ہی لمحے سوال ذہن کے تاریک گوشے میں ڈوب جاتا۔ کیونکہ کھڑی چمنیوں کے منہ سے نکلتا ہوا بھیانک زہریلا دھواں اُسے اپنی جانب بُلا رہا ہوتا تھا۔ وہ کسی اَن دیکھی قوت کے زیر اثر سنگِ سیاہ کی عالیشان عمارت کی طرف دوڑتا تھا، روز آتا تھا جاتا تھا۔ شام کو وہاں سے لوٹ کر پتھر کو سڑک سے اُٹھا کر فٹ پاتھ پر رکھ دیتا تھا کہ کسی اور راہی کے لئے مصیبت نہ بنے۔ کسی کے پیر، کسی کے قیمتی جوتے کو زخمی نہ کرے لیکن اگلے دن اِس پتھر کو پھر سڑک کے بیچوں بیچ پڑا ہوا پاتا تھا ـــــ اب یہ عام سی بات ہوگئی تھی۔ اُس نے سوچنا ہی چھوڑ دیا۔

لیکن... ایک روز جیسے ہی اُسکے سنگ تراش دوست کی نظر اس پتھر پر پڑی۔ وہ چونک سا اُٹھا... غور سے اس پتھر کو دیکھنے لگا، جیسے پتھر نہ ہو، کوئی قیمتی ہیرا ہو... اگلے ہی لمحے سنگ تراش کے چہرے پر مسرت کی کرنیں نمودار ہوگئیں۔ اُس نے من ہی من میں کوئی فیصلہ کیا اور پتھر کو اُٹھا کر گھر لے گیا۔

کچھ دن بعد اُس نے سنگتراش دوست کے گھر جا کر دیکھا

پتھر کے حلیے میں موہوم سی تبدیلی آگئی تھی، ایک دلکشی جھلکنے لگی تھی، سنگتراش کی اُنگلیاں واقعی کمال دکھا رہی تھیں۔

اُس نے پوچھ ہی لیا

''تم نے اس کے لیئے بھی کوئی خاص آکار سوچا ہے؟''

''ہاں'' سنگتراش نے سر کو ہلکی سی جنبش دی

اور اچانک اُس کی تخلیق کردہ خوبصورت مورتی کی ہنسی کمرے میں سنائی دی۔ سنگ تراش بھی مسکرایا.... عجیب سی مسکراہٹ تھی

وقت اور حالات کا ایک عجیب سا موڑ تھا۔ ایک ایسے ہی پتھر کا مدت سے آرزومند تھا۔ گلی گلی... شہر شہر ایسے ہی پتھر کی تلاش میں مارا مارا پھر چکا تھا۔

سنگ تراش اور پتھر... خالق اور مخلوق.... انسان اور شیطان۔ شیطان انسان سے زیادہ قوی اور ضدی ہے کہ آج تک اپنی فطرت نہ بدلی۔ اپنے مقصد، اپنے موقف پہ ڈٹا رہا۔

سنگ تراش نے راتوں کی نیند اور دن کا چین اس پتھر پر لٹا دیا۔

اُس کی بھرپور محنت، لگن اور فن کارانہ انگلیوں نے بے جان پتھر پر ایک نیا اور اچھوتا نقش چڑھا دیا تھا۔ پتھر میں جان سی آگئی تھی۔ پتھر اب بولتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اُس دن سنگ تراش خوش تھا کہ اُس کی زندگی کا ایک خواب پورا ہو چکا تھا۔ اُس کی تخلیق مکمل ہو چکی تھی۔ اُسے اپنی عظمتوں کا لوہا منوانا تھا۔ اِس شاہکار مجسمے کو منظر عام پہ لا کر مداحوں سے داد حاصل کرنی تھی۔ وہ اس پتھر کو اُسی سڑک پر لے آیا... جہاں سے کہ اُٹھایا تھا۔

سڑک پر لوگوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ ان میں سنگتراش کے مداح بھی تھے اور فن کے سودائی بھی... ایک سوداگر سے سودا طے ہوا۔ سنگ تراش نے پتھر کا حسین

مجسمہ سوداگر کے حوالے کر دیا لیکن دوسرے ہی پل سنگتراش کے سینے میں بائیں طرف درد کی ایک ٹیس اُبھر آئی۔ اُس نے اچانک اپنے اندر ایک خالی پن سا محسوس کیا۔

وہ کچھ بُجھا بُجھا اور تھکا ہوا سا گھر چلا آیا۔ اپنے کمرے میں آکر یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جس مورتی کے ہونٹوں پر اُس نے خوبصورت شاداب مسکراہٹ سجائی تھی

کچھ اُداس سی نظر آ رہی ہے

مسکراہٹ غائب ہے اور آنکھوں میں کچھ آنسو... چھلکنے کو بے تاب۔

☆☆☆

پیاسا

ریشمی.... یوں خاموشی سے مجھے نہ تکے جاو۔ دیکھو میرا دم گھٹ رہا ہے۔ بولو... خدارا کچھ بولو۔ جو جی میں آئے کہو، جس طرح چاہو، مجھے ذلیل و رسوا کرو ___ آخر یہ خاموشی کیوں۔؟ کب تک تمہاری خاموش نگاہیں مجھ سے قصاص لیتی رہیں گی۔

ہاں میں پاپی ہوں۔ مجھے گناہ کا احساس ہے۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔ تاریکی مجھے ڈس رہی ہے۔ اور اُجالا میرے حال پہ قہقہے لگا رہا ہے مگر ریشمی تو ہی بتا۔ کیا یہ میرے کئے کی سزا نہیں ہے۔؟

ارے... تو کہاں گئی۔ کیا تو میری کہانی سُنے بغیر ہی چلی جائے گی۔ ہاں تو چلی گئی ہے۔ تیرا جسم چلا گیا۔ دور بہت دور... مگر میں جانتا ہوں۔ تمہاری روح یہیں کہیں بھٹکتی ہوگی میرے آس پاس.......

اُف یہ قہقہہ... وحشیانہ قہقہہ جو میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ کس کا ہے۔؟ کون درندگی کا مظاہرہ کر رہا ہے...؟ ریشمی تم ___ ہاں آواز تمہاری ہی

ہے۔ مگر کیوں ـــــ؟ کیا یہ زہریلا قہقہہ میری بربادی کا جشن ہے۔ میری ناکامی اور محرومی کا مذاق ہے۔ میں جانتا ہوں۔ سارا زمانہ میرے حال پہ خندہ زن ہے۔ آخر ایک تو ہی کیوں دل کی بھڑاس نکالنے سے باز رہتی۔ ہنسو، جی بھر کے ہنسو۔ مجھے گلا نہ ہوگا۔ آخر ہوتا بھی کیوں ـــــ؟

میں کون ہوں تیرا ـــــ کوئی بھی تو نہیں۔ ایک زمانا بیتا۔ جب میں تیرا تھا اور تو میری تھی۔ سپنے ایک تھے اور منزل بھی ایک ہی تھی ـــــ شاید اُس شام کے بعد تو بدلی۔ تیرا ایمان بدل گیا۔ منزل تمہاری راہ تک رہی تھی۔ تو نے منزل کی پروانہ کی۔ میرا ساتھ چھوڑا اور اپنے لئے ایک نئی راہ منتخب کرلی......

شام ـــــ وہ حسین شام، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں گھر پر اپنے کمرے کی کھڑکی سے ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھ رہا تھا۔ آسمان کا مغربی حصہ بے حد سرخ تھا۔ یہ سرخی آہستہ آہستہ گھٹتی جارہی تھی اور سیاہ تاریک دھبے بڑھتے جا رہے تھے.....

اچانک میں نے تمہاری نرم و نازک آہٹ محسوس کی... میں نے دیکھا تُو کچھ پریشان سی تھی۔ تمہارے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ میں پریشان ہو اُٹھا۔ گھبرا کر پوچھا

"ریشمی... کیا بات ہے۔؟"

تم نے کچھ دیر میری آنکھوں میں ڈوب کر دیکھا۔ پھر اچانک سوال کیا

"کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔؟"

میں نے تمہاری طرف غور سے دیکھا۔۔۔ دو آنکھیں کہہ اُٹھیں۔۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ یہ تو نے کیا پوچھا آج۔۔۔ کیا تُجھے میری محبت کا احساس نہیں۔ اپنے دل پر بھروسہ نہیں۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے۔ تمہارے بغیر میرا وجود نامکمل ہے۔ میرا جینا محال ہے۔

تو نے چند لمحوں کا سکوت توڑا اور کہا

"محبت کیا ہے۔ کسے کہتے ہیں یہ مجھے معلوم نہیں۔۔۔ ہاں اگر بیٹھے سپنوں کا نام ہے۔ نامعلوم حسین وادیوں میں کھو جانے کو کہتے ہیں۔ ایک دھڑکن، ایک تڑپ ہے۔ ایک انجانی خوشی کا احساس، ایک عجیب قسم کی بے قراری اور سب سے بڑھ کر تمہارا تصور... اگر یہی محبت ہے۔ ایسا ہی محبت میں ہوتا ہے۔ تو دنیا کی کوئی بھی طاقت مجھے یہ کہنے سے روک نہیں سکتی کہ مجھے تم سے محبت ہے"

میری آنکھیں بے ساختہ کِھل اُٹھیں.. تو کہتی رہی

"میں تم سے شادی کرونگی۔ تمہارے بچوں کی ماں بنوں گی۔ ہمارا چھوٹا سا گھر ہوگا۔ گھر کے سامنے ایک خوبصورت باغیچہ ہوگا۔ جس میں ہمارے بچے کھیلینگے۔ میں تمہارا انتظار کیا کروں گی اور جب تم کام سے لوٹ کر آؤ گے تو تمہیں ٹوٹ کر پیار کرونگی۔۔۔ زندگی کی حقیقی خوشیوں سے مالا مال کر دونگی"

تو بڑی معصومیت سے سوتے جاگتے میں دیکھے ہوئے خواب دہرا رہی تھی

"مگر...." اچانک تیرے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا

"مگر کیا۔؟" میں بے قراری سے بول اُٹھا

''ہم ایک دوسرے کے نہیں ہو سکتے...''

''کیوں ---- ہم ایک دوسرے کے کیوں نہیں ہو سکتے...؟''

میں نے چیخ کر پوچھا..

تُو نے گھور کر مجھے دیکھا ---- لمحہ بھر خاموشی کے بعد کہا

''زمانہ ہمیں ایک دوسرے سے جُدا کر رہا ہے..''

میں چونک سا پڑا اور محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ آتے وقت تمہارا چہرہ کیوں پریشان سا تھا۔ تمہاری آنکھیں کیوں سوجی ہوئی تھیں۔ تو یقیناً روئی تھی ---- کیا تُجھے کریم چاچا نے پیٹا تھا۔ مجھ سے ملنے سے روکا تھا۔ کیا تمہیں بھی اونچ نیچ، امیری غریبی.........

''نہیں نہیں ----'' میں اچانک بول اُٹھا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے جُدا نہیں کر سکتی...''

تمہارے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ اُبھر آئی

''یہ تم کہہ رہے ہو یا تمہاری محبت کا جنون....''

میں چیخ پڑا

''یہ میں کہہ رہا ہوں ---- میرا دل کہہ رہا ہے''

''دل اور دماغ میں بہت فاصلہ ہوتا ہے'' تُو نے فلسفیانہ انداز میں کہا..... اور ایک سچی بات کہی تھی تم نے... واقعی دل اور دماغ میں بہت فاصلہ ہوتا ہے۔ دل کچھ کہتا ہے اور دماغ کچھ اور...

تُو نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا

"میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں... کوئی بھی قربانی دے سکتی ہوں۔ مگر مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ تمہارے مضبوط سہارے کی ضرورت ہے۔ بولو... کیا تم میرا ساتھ دو گے۔ اپنے اونچے خاندان کو ٹھکرا کر مجھے اپنانے کی جرأت ہے تم میں۔ زمانے کا مقابلہ کرنے کی سکت ہے تم میں... بولو ـــــ بولو....."

میں نے خاموشی اختیار کی۔ مجھ میں واقعی اتنی ہمت نہ تھی ـــــ تُو بہت دیر تک سوالیہ نظروں سے مجھے تکتی رہی، گھورتی رہی ـــــ تیرے چہرے پر کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔ پھر تُو نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا اور حقارت سے آنکھیں پھیر لیں اور اُٹھ کر چلی گئی۔ میں جانتا تھا کہ تُو مجھ سے روٹھ کر چلی گئی بالکل اُسی طرح جیسے بچپن میں تُو کسی بات پر خفا ہو کر چلی جاتی تھی اور ہمارے بنگلے کے سامنے تیرا جو چھوٹا سا مکان تھا۔ اُس کی کھڑکی سے جھانکتی رہتی ـــــ تُجھے یقین ہوتا تھا کہ میں آؤں گا اور تُجھے مناؤں گا ـــــ مگر ریشمی آج میں تُجھے نہیں منا سکتا۔ تُجھے معلوم نہیں حالات نے مجھے کس قدر بے بس اور بزدل بنا دیا تھا۔ ابا کی غصیلی طبعیت سے میں بہت ڈرتا تھا۔ خاندانی وقار اور ذات برادری کے فسانے وہ روز ہی مجھے سمجھاتا رہتا تھا... اُن کی اِن باتوں سے میرا خون کھول اُٹھتا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ابا کی کسی ایک بات کا جواب دے سکوں... ہاں ماں کبھی کبھی میری طرف داری میں اُن سے لڑنے بیٹھتی مگر نتیجہ صفر.....

وہ رات میں نے آنکھوں آنکھوں میں کاٹی... اگلی صبح چنار باغ میں تمہارا

انتظار کیا۔ مگر تو نہ آئی۔ مجھے عجیب سا لگا۔ زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا۔ چنار کا بوڑھا جانا پہچانا درخت تیری راہ دیکھ رہا تھا۔ ہوا تیز تھی۔ پتے کانپ رہے تھے۔ میں بھی کانپ رہا تھا۔ جی میں آیا۔ سارے گاؤں والوں کو تیرے گھر کے سامنے اکٹھا کر کے چلاؤں۔ شور مچاؤں اور کہوں ـــــ کس نے تجھے مجھ سے ملنے سے روکا ہے۔ کس نے تُجھے قید کر رکھا ہے۔ تُجھے ڈر ہے۔ کس کا ـــــ کریم چاچا کا... میرے ابا کا... باپ.. یہ کیسے باپ ہیں۔ جو ظالم سماج کی خوشی کے لئے اپنے بچوں کی زندگیاں تباہ کر دیتے ہیں.. اُن کی اُمنگیں، ارمان سپنے خاک میں مِلا دیتے ہیں۔

ریشمی... میں تمہارا مشکور ہوں۔ کل کے واقعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میرے ضمیر کو جھنجھوڑا۔ کل جس بُزدلی کا مظاہرہ میں نے کیا۔ میں اُس کے لئے شرمندہ ہوں... تو مہان ہے۔ تُو نے میرے حوصلے بڑھا دئے۔ مجھے جینے کا سلیقہ سکھا دیا۔ ریشمی آو۔ میں نے ساری رات سوچ سوچ کر ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ ایک اہم فیصلہ... جس کا تعلق روح کے رشتوں سے ہے۔ ہم دونوں کی زندگی سے ہے۔ تمہارے اور میرے مستقبل سے ہے۔

میں تمہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سُن کر مجھے دُکھ ہوا کہ تُو آج ہی کسی رشتے دار کی شادی میں گئی ہوئی تھی ـــــ اس طرح مہینہ گزر گیا۔ مگر تُو نہ آئی۔ تقریباً ڈیڑھ مہینے کے بعد تُو مجھے ملی

تمہاری آمد سے میرا کمرہ کِھل اُٹھا۔ مگر یہ کیا۔؟ تُو نے اپنی یہ کیا حالت

بنا رکھی ہے۔ زرد چہرہ، سوکھے ہونٹ، کھوئی کھوئی اُداس آنکھیں... میں سوچ رہا تھا میں تُجھے اپنا فیصلہ سناؤں یا تیری حالت پوچھوں کہ تُو نے حقارت سے مجھے دیکھ کر کہا۔

''مجھے معلوم نہیں تھا، تم اتنے کمینے ہو''

میں کانپ اُٹھا۔ کانپتی ہوئی آواز میں کہا

''ریشمی... یہ تُو کیا کہہ رہی ہے...؟''

''وہی جو تُم ہو۔ جس کا مظاہرہ تم نے کیا...''

میں نے ذہن پر زور دیکر اپنی کمینگی کا جائزہ لینا شروع کیا.... کمینہ...! تم نے ٹھیک کہا تھا۔ واقعی میں کمینہ تھا۔ جس نام کے لئے محبت کرنے والے اپنا نام و نشان تک مٹا دیتے ہیں۔ وہ نام تم نے مجھے دیا۔ کمینہ...

میں کتنا بے بس تھا، چاہتے ہوئے بھی نہ پوچھ سکا۔ کیا یہی نام کمانے کے لئے تم سے میں نے محبت کی تھی.. کیا میں اسی نام کا مستحق تھا۔ آخر اس نام سے تم نے مجھے کیوں نوازا___؟ کیا اِسی نام کو پانے کے لئے میں نے پچھلے ڈیڑھ مہینے میں خود کو بدلا تھا۔ تمہیں پانے کے لئے اپنے ابا سے جھگڑا مول لیا۔ تمہارے بابا کریم چاچا کے سامنے خود کو بے عزت کرایا۔ ہمسایوں کی باتیں سنیں۔ رشتے داروں میں ذلیل و خوار ہوا___ دوستوں کی حقارت بھری نظریں برداشت کیں___ کیا یہ نام میری بے انتہا محبت کا صلہ ہے....؟

میں بہت دیر تک اپنے حال پہ روتا رہا

میں نے آنکھیں ___ دونم ناک آنکھیں کھول کر دیکھا.....

وہاں تیرا نام ونشان تک نہ تھا۔ تُو نہ جانے کب چلی گئی تھی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا___ غم، غصہ، ماتم اور ناکام حسرتوں کی موجیں میرے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔

چند دن بعد میں نے وہ گاؤں ہی چھوڑ دیا___ اور شہر چلا آیا۔ تُو تو جانتی ہی ہے شہر میں ہمارا کتنا بڑا کاروبار تھا۔ میں نے سوچا تھا۔ شہر میں میرا کھویا ہوا سکون مل جائے گا۔ میری اُچاٹ طبعیت بہل جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شہر میں کیا تھا میرے لئے۔ کچھ بھی نہیں... صرف لوگ، بے پناہ لوگ... نت نئے فیشن، اونچے اونچے مکان، بڑی بڑی سڑکیں، بسیں، کاریں، دھوپ بن سایہ... یہی سب کچھ تو تھا شہر میں... وہ باغ، وہ کھیت، وہ گلیاں، وہ گھوڑے، وہ چنار کا بوڑھا درخت تو نہیں... جسکے سایے میں ہم بچپن میں آنکھ مچولی کھیلا کرتے تھے۔ جہاں ایک بار نظروں کا تصادُم ہوا۔ ہم دونوں شرمائے اور یہ احساس شدت سے جاگ اُٹھا کہ اب ہم جوان ہو چکے ہیں۔

ابھی شہر میں میرے کچھ ہی دن گزرے تھے کہ ابا جان نے اپنی کمپنی کے آفس میں شاید میری طبعیت بہلانے کے لئے ہی ایک جوان لڑکی کو میری سکریٹری مقرر کیا... شہلا، بیس اکیس سال کی ایک خوبصورت تتلی تھی۔ پہلے ہی دن سے میرے قریب آنے کی کوشش میں لگ گئی۔ شاید ایسا کرنے کیلئے ہی ابا جان نے اُسے کام دیا تھا۔ ایک دن وہ کہہ اُٹھی

''میں آپ سے محبت کرتی ہوں....''

میں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ وہ شوخ انداز میں مسکرائی

''اور یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ بھی مجھے دل سے چاہتے ہیں''

میں نے اپنے دل میں جھانکا ___ دل... جو ایک ہوتا ہے جس کے چار خانے ہوتے ہیں۔ میں نے باریک نظروں سے ان خانوں میں دیکھا ____ لیکن وہاں تم... صرف تم دکھائی دی۔ تمہارے مختلف روپ دکھائی دیئے۔ بچپن کا حسین روپ _ جوانی کا وہ نشیلا روپ جب تم مجھ سے شرمانے لگی تھی۔ اور وہ سنگ دل روپ... جب تم نے مجھے کمینہ کہا...

''کیا سوچ رہے ہو...؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا... وہ میرے قریب آ گئی اور ایک شریر نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے میرے سینے سے لگ گئی۔ میں بوکھلا سا گیا۔ ایک عجیب قسم کی لہر نے میرے سارے وجود کو جھنجھوڑ ڈالا۔ جانے وہ کیسی کشش تھی۔ کیسی مہک تھی کہ میں چاہتے ہوئے بھی اُسے اپنے سے الگ نہ کر سکا۔

وہ کچھ کہہ رہی تھی ____ کیا کہہ رہی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں... اچانک میرے بازو حرکت میں آ گئے اور میں نے اُسے اتنی زور سے بھینچ لیا کہ اُس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ شام مہک رہی تھی اور جذبات مچل رہے تھے اور پھر میرا وجود ایک نئی منزل سے آگاہ ہو گیا۔

ہاں ریشمی یہ ایک حقیقت ہے۔ میں تمہیں بھلا نہیں پا رہا تھا حالانکہ میں

نے بہت کوشش کی..راتیں میرے لئے عذاب تھیں.....ایک نہیں..دونہیں پورے
تین سال بیت گئے مگر میں نے گاؤں واپس لوٹنے کا کبھی نام بھی نہ لیا۔ماں نے
طرح طرح کے طریقے آزمائے۔ بیماری کا بہانہ بنایا۔کسی چاندسی دلہن کا واسطہ
دیا...مگر سب کچھ بے سود ــــــ گاؤں میں میرا کون تھا، کوئی بھی نہیں۔ایک تُو تھی۔
تُو بھی نہ جانے کس دنیا میں کھوگئی تھی۔

ادھر ایک شہلا تھی...نازلی تھی..سب کچھ دیر ساتھ نبھا کر اپنی اپنی منزل کی
طرف چل دیں ــــــ صرف ایک کمینہ رہ گیا۔

ہاں یہ میری کمینگی تھی۔دُبلے پتلے جسم کا مریل سا نوجوان میری کار کے
نیچے آتے آتے بچ گیا۔اُس نے ہائے کیا نہ وائے...صرف اُس کی دو چھوٹی چھوٹی
آنکھیں مجھ سے التجا کر رہی تھیں..صاحب میں کئی دنوں سے بھوکا ہوں۔مجھے کام کی
تلاش ہے....مجھے کام دو کام...

وہ پڑھا لکھا تھا ــــــ میں نے اُسے اپنے آفس میں کلرک رکھا۔وہ اکثر
بیماری کی وجہ سے غیر حاضر رہا کرتا تھا۔مگر میں نے اُسے کبھی ٹوکا نہیں بلکہ مجھے اُس
سے جانے کیوں ہمدردی سی ہوگئی تھی ــــــ ایک دن جب وہ میرے آفس میں غش
کھا کر،گر پڑا تو میرے اسٹاف نے اُسے نزدیکی ہسپتال میں داخل کرایا...کئی دنوں
کے بعد اُسے چھٹی دی گئی...

اُس شام ــــــ جب میرے چپراسی نے مجھ سے کہا کہ اختر مرزا کی
حالت زیادہ ابتر ہوگئی ہے۔مشکل سے ایک دو دن کا مہمان نظر آتا ہے ــــــ تو مجھ

سے رہا نہ گیا۔ فوراً چپراسی کو لے کر اُس کے گھر کی طرف چل پڑا۔۔

اُف ریشمی! یہ مت پوچھ اُس وقت مجھ پہ کیا بیتی۔ جب میں نے کھولی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔۔۔ تو تمہیں سامنے کھڑا پایا۔۔۔

''تت۔۔۔ تم۔۔۔!'' میرے ہوش و حواس پر بجلی سی گر پڑی۔ تمہاری آنکھیں بھی حیرت اور نہ جانے کس جذبے سے پھیل گئیں۔۔۔ تُو شاید میرے بارے میں ہی سوچ رہی تھی کہ مجھے تیرا پتا کس نے بتا دیا؟

''آپ ہمارے مالک ہیں۔۔۔'' بروقت میرے چپراسی نے تمہاری مشکل آسان کر دی

''آ۔۔۔ آپ۔۔۔!'' تم نے چونک کر مجھے دیکھا۔ جیسے کہہ رہی تھی کمینہ۔۔۔ میرے شوہر کا مالک۔۔۔۔ نہیں نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔

بہت دیر تک میں تمہارے شوہر کے سرہانے بیٹھا تمہیں تکتا رہا۔ اختر مرزا بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ اُس کی نیم وا آنکھوں سے مجھے وحشت ہو رہی تھی۔ اس گھٹن آلودہ کمرے میں میری سانسیں بے ہنگم رفتار سے چل رہی تھیں۔ مگر تمہارے وجود نے مجھے گھٹن کا احساس نہ ہونے دیا۔

دفعتاً چپراسی ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آ گیا۔ معاینہ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔ دورہ معمولی سا ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے'' ڈاکٹر صاحب نے چند آرام کی ٹکیاں بیگ سے نکال کر دیں۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد چپراسی بھی چلا گیا۔ میں نے تمہاری نظریں بچا

کر ایک نہیں دو نہیں تین ٹکیاں تمہارے شوہر کو کھلا دیں ـــــ نہیں نہیں اس لئے نہیں کہ وہ مر جائے۔ میں بس یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ سُن نہ پائے۔ کچھ دیکھ نہ پائے۔اور پھر ایسا ہی ہوا۔تھوڑی ہی دیر میں وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔

تُو اُٹھ کر چلی گئی۔ میں بھی غیرارادی طور پر اُٹھا اور تمہارے پیچھے چلا آیا۔ وہ شاید رسوئی کا کمرہ تھا ۔ ہر طرف بے ترتیبی اور ویرانی جھلک رہی تھی۔ میرے ہونٹ اچانک حرکت میں آگئے... ''ریشمی زندگی میں یہ کیسا موڑ آیا۔ہم ملے تو کس حال میں......''

تُم نے ٹھنڈی سانس لے کر میری طرف دیکھا لمحہ بھر کے لئے کچھ سوچا. پھر جانے کیوں اچانک اپنی نظریں دوسری طرف پھیرلیں..

ماضی ـــــ حال اور مستقبل.... میں سب کچھ بھول کر تمہیں دیکھتا رہا ـــــ تمہارے کُھلے بال۔تمہارا چمکتا ہوا ماتھا... پھٹا ہوا بلاؤز...جوان گوری بانہیں..اُداس سیاہ آنکھیں ـــــ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دور کوئی پنچھی گا رہا ہے۔ بھٹکا ہوا راہی منزل کے قریب ہے.......مدتوں کا پیا سا سمندر کے قریب ہے....!

☆☆☆

میری اولین کہانی جو ''کمینہ'' عنوان کے تحت شائع ہوئی تھی

سال اشاعت:۱۹۷۴ء

شکر بابا

پتہ نہیں ـــــ کون تھا وہ کہاں سے آیا تھا..؟ وہ کچھ عرصے سے اُس شہر میں دکھائی دیا..... کندھوں پر شکر کی بوری لئے... کبھی شہر کے بڑے چوراہے پہ نظر آتا. تو کبھی کسی کم آباد اُچاٹ سی گلی میں اور کبھی کسی اور سڑک پر..

اچھے موڑ میں ہوتا ـــــ تو میٹھے سُروں میں کبھی گا بھی لیتا۔

لے لو شکر.... میٹھا شکر

مفت یہ شکر...

شکر بابا ہے آیا تیرے شہر میں...

لے لو شکر... میٹھا شکر...

وہ بلا لحاظ مذہب رنگ لوگوں میں یہ شکر تقسیم کر رہا تھا ـــــ بغیر کسی معاوضے کے... مگر لوگ.. لوگ اُس سے دور بھاگتے تھے۔ اُسے شک کی نظروں سے دیکھتے تھے...

سیاست دانوں نے کہا..

''دشمن کا جاسوس ہوگا... اور کون ہوگا۔''

دانشوروں نے فتویٰ دیا

''فریبی ـــــ کوئی ڈھونگی ہوگا ـــــ جال پھینکتا ہے۔ نہ معلوم کیا لوٹ کے جائے گا یہاں سے۔''

فلسفیوں نے اُسے موضوع بحث بنایا

''آخر وہ کیوں یہ شکر مفت تقسیم کر رہا ہے۔''

بڑے بزرگوں نے کہا۔

''نہ ایسا سُنا ہے۔ نہ ایسا دیکھا ہے کبھی۔ کون کسے کیا مفت دے گا۔ ضرور کوئی جعلساز ہوگا''

جوان حسیناؤں نے آپس میں کہا

''شکر وکر تو ایک بہانہ ہے۔ وہ ہمیں پھسلانے کے لئے دانہ پھینک رہا ہے..''

اور ماؤں نے اپنے بچوں کو سمجھا دیا ـــــ بلکہ ڈرا دیا...

''سُنا تم نے۔ اُس کے پاس ہرگز نہ جانا.. وہ بوری میں بھر کے تمہیں لے جائے گا۔''

''ماں ـــــ کہاں لے جائے گا۔؟''

''وہیں... جہاں سے وہ آیا ہے''

''ماں... وہ کہاں سے آیا ہے؟''

''کیا پتہ ـــــ کہاں سے آ گیا ہے.. تم نے یاد رکھا.. ہرگز بھی اُس کے

قریب نہ جانا۔"

بچے ـــــ آخر بچے تھے۔ ڈر سے گئے اور گھروں کے نیم تاریک کونوں میں چھپ گئے۔

شکر بابا اپنی ہی دھُن میں مست رہنے والا آدمی تھا۔ لوگوں کی باتوں کی کم ہی پرواکرتا تھا وہ تو بس اپنا کام پورا کر رہا تھا۔ دن بھر شکر کی بوری کاندھوں پہ اُٹھائے کبھی اِس گلی میں نظر آتا تو کبھی اُس موڑ پر اور کبھی کسی باغ یا میدان میں ـــــ شام کو اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر خدا کا شکر ادا کرتا کہ جس کے مقدر میں جو دانا لکھا تھا۔ اُسے وہ دے آیا ہے۔

وقت اور موسم ایک سانہیں رہتا ہے

موسم بدل گیا تھا۔ ننگی ٹہنیوں پر اب سبز لباس اُگ رہا تھا اور بدلتے موسم کے ساتھ ہی لوگوں کے سوچنے کے انداز میں بھی تبدیلی آ گئی۔

سیاست کاروں نے یک زباں ہو کر کہا...

"شکر بابا۔ انسانیت کا دوست ہے۔ محبت کا علم بردار ہے"

دانشوروں نے اپنی رائے بدل ڈالی تھی..

"ایک نیک روح۔ ایک مہان انسان.. ایک درویش.."

بزرگوں نے اپنی آواز ملائی

"ماضی میں بھی بہت سے ایسے لوگ گزرے ہیں۔ جو نام کما گئے ہیں۔ جو سخی تھے۔ سب کو کچھ نہ کچھ دیتے تھے اور کسی سے کچھ نہ لیتے تھے۔"

جوان حسیناؤں اور عورتوں نے ایک ہی زبان میں کہا

''ایک مہربان جوگی ـــــ نہ معلوم کس جوگن کا خواب ہے''

اور بچے ـــــ جو پہلے ڈرتے تھے.. دور بھاگتے تھے اُس سے ـــــ اب اُس کے قریب ہی ہنستے مسکراتے اپنے لڑکپن کے کھیل (کاٹ شاہی بم ـــــ بم شاہی کاٹ) کھیلتے ہوئے نظر آتے... اور شکر بابا بھی اُن کے ساتھ گھل مل جاتا تھا۔ اُن کی سُنتا، اپنی سُناتا اور پھر اپنا وہی مخصوص گیت گنگنا اُٹھتا..... لے لو شکر میٹھا شکر

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک صبح.... جونہی وہ نیند سے بیدار ہوا۔ اُس کی نگاہیں بوری سے جا ٹکرائیں ـــــ وہ چونک سا پڑا۔ وقت بہت آگے جا چکا تھا.. بوری قریب قریب خالی ہو چکی تھی ـــــ تو... تو کیا یہ شہر چھوڑنے کا وقت آ گیا ـــــ وہ اچانک کچھ اُداس سا ہو گیا... مذید کچھ سوچے بغیر بستر سے اُٹھ گیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ شکر کی بوری کندھوں پر اُٹھائی اور نکل پڑا شہر کے بڑے چوراہے کی طرف۔

جب وہ شکر کا آخری دانہ تقسیم کر چکا تو اُسکے چہرے پر مسرت اور اطمینان سا جھلکنے لگا ـــــ اُسنے دور دور تک نظریں دوڑائیں ـــــ شہر اُسے خوبصورت لگا... اپنا سا لگا... پیارا سا لگا... اُس نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کیں... جیسے شہر کا سارا حسن اپنی نگاہوں میں قید کرنا چاہتا ہو۔

اب اُس کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ اُس نے خالی بوری اپنی بغل میں چھپائی.. اور شہر کے بڑے چوراہے کو اپنے پیچھے چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قدموں

کے ساتھ نکل پڑا۔

کچھ ہی دور جانے کے بعد اچانک اُسے خیال آیا...

لوگ کہاں گئے ہیں ـــــ شہر کے سارے لوگ، عورتیں، بچے... عموماً جو بھیڑ بھاڑ اُس کے اردگرد ہوتی تھی.... آج وہ اُسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ حیران سا رہ گیا۔ مجبور انسان... کسی کام میں مشغول ہونگے۔ اُسنے خود کو تسلی دی ـــــ لیکن خود کے ایک حصے نے سوال کیا۔ دانشوروں اور سیاستدانوں کی آنکھوں میں کیوں آج پہلی سی اجنبیت جھلکتی ہے...؟ ماؤں نے کیوں آج اپنے بچوں کو مکانوں کے اندر چھپا دیا ہے ـــــ عورتیں کیوں آج بدلی بدلی بیزار سی نظر آتی ہیں ـــــ یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں آج ـــــ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا.. اُس کے قدم بھاری سے ہو گئے۔ وہ تھکے تھکے قدموں کے ساتھ چلنے لگا.. اُسے لگا۔ وہ اس شہر میں اکیلا ہے۔ یہاں اُس کی کوئی پہچان نہیں ہے۔

پہلے اُسے شک تھا۔ لیکن شہر والوں کی بے حسی اور بے رخی دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ ریت.. ریت ہی ہے

وہ دور دور تک پھیلے ہوئے مکان... سڑکیں، کاریں اور لوگوں کو دیکھ کر اندر ہی اندر چیخ اُٹھا۔

ریت کا شہر ہے یہ..... ریت کے مکان..... ریت کے انسان..... ریت کا کاروبار ـــ چاروں طرف بس ریت ہی ریت!

شہر والوں کی بے رخی نے اُسے ایک گہرا زخم دیا تھا.......

وہ اب جلد سے جلد یہ بے وفا شہر چھوڑ دینا چاہتا تھا..... تیز قدموں سے چلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اُس کے قدم ادھر اُدھر لڑکھڑا رہے تھے۔ خشک ہونٹوں پر بار بار تری کرنے سے اُسکی زبان سوکھ گئی تھی ـــــ اور آنکھوں میں ویران اندھیرے سے چھا گئے تھے۔

بلآخر جب وہ شہر کے آخری موڑ کے نزدیک پہونچا تو اچانک دور سے آئی ہوئی ایک آواز اُسکے کانوں سے ٹکرائی...

"شکر بابا۔ ٹھہرو".

اُس نے مُڑ کر دیکھا_

"ہمیں مفت شکر دینے والے بابا ٹھہرو." ـــ

بڑے شہر کا ایک چھوٹا سا کوچہ پیار اور عقیدت سے آوازیں دے رہا تھا۔ اُسکی جانب تیزی سے بڑھ رہا تھا ـــ محض چند لوگ ـــ دو مرد، کچھ بچے، دو تین عورتیں۔

وہ اندر ہی اندر شرمسار سا ہو گیا.. آنکھوں میں آنسوؤں کا ریلا روک کر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر بولا

"ہے شکرے..... تو بھول گیا تھا..... انسان لاکھ خود غرض سہی بے ضمیر اور بے حس نہیں ہے...... truth is always here"

☆☆☆

میرالال

رات خاموش اور حسین تھی...

ٹھنڈی ہوائیں کسی دُلہن کے گھونگھٹ کی طرح آہستہ آہستہ سرسرا رہی تھیں... چاند... بھرپور چاند دلکش سماں پیدا کیے ہوئے مسکرا رہا تھا مگر اگلے ہی لمحے یہ سب کچھ بدل گیا۔ رات تاریک اور وحشتناک ہوگئی۔ چاند چھپ گیا، اُسکی مسکراہٹ سیاہ خوفناک بادلوں نے نوچ لی۔ بالکل اُسی طرح جس طرح رخسانہ کی مسکراہٹ ہم محلے والوں نے چھین لی تھی۔

محلے کے ہر ایک فرد کو رخسانہ سے نفرت کرنے کا پورا پورا حق تھا۔ جواں بوڑھے، مرد عورتیں.... سبھوں نے اُس کا جینا دشوار کر دیا تھا۔ طنز.... حقارت اور نفرت! یہ تین چیزیں اُسکے وجود کا ایک حصہ بن چکی تھیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے صرف چند سال پہلے وہ کتنی ہر دل عزیز تھی۔ کتنی معصوم اور شوخ تھی۔ ہر کوئی اُس کا گرویدہ تھا۔ وہ ہمارے گھر بھی آتی جاتی تھی.. میرے ساتھ کھیلتی.. لڑتی، جھگڑتی، خفا ہوتی اور خود ہی مان بھی جاتی۔ لیکن جب کبھی اُس کا غصہ نہ اُترتا.... تو کہتی —— تُو کیوں مجھے چھیڑتا ہے.... دیکھ میں ابھی تجھے پٹوا دونگی.. تیری شکایت امی جان سے کر

دونگی۔ میں مسکرا کر اُس کے پیچھے بھاگنے لگتا اور وہ انگوٹھا دکھا کر ماں کے کمرے میں چلی جاتی۔ وہ میری ماں کو امی جان ہی کہتی... اُسکی اپنی ماں مرگئی تھی۔ میری ماں بھی اُسے بہت چاہتی تھی۔ بہت پیار کرتی تھی، بالکل اپنے بچوں کی طرح.... مگر وہ دن منحوس تھا، عجیب سا تھا۔ میں نے ماں کا دوسرا ہی روپ دیکھا.... وہ روپ جس کا مجھے اور نہ شاید رخسانہ کو ہی گمان تھا۔ ماں نے اچانک بے حد تلخ لہجے میں رخسانہ سے کہا

''تُو یہاں کیا کرنے آگئی ہے۔ تیرا گھر کیا جل گیا ہے... آئندہ کبھی یہاں دکھائی دی... تو میں تیری ٹانگیں توڑ دونگی''۔

''مہ... مگر امی جان....'' رخسانہ کی آواز ڈوب گئی۔ کچھ کہہ نہ سکی۔ آنسو بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھتی رہی... دفعتاً ماں نے مجھے حکم دے کر کہا

''نکال دو اسے باہر ــــ ابھی اور اسی وقت... میں اس کی صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتی....''

میں ماں کے غصے سے واقف تھا۔

ناچارگی کے ساتھ رخسانہ کی طرف میرے قدم اُٹھ گئے... اور اُسی پل ایک حسرت آمیز نظر مجھ پر ڈال کر وہ اپنے گھر کی طرف چل پڑی...

یہ... یہ تبدیلی... ماں کا بدلا ہوا رویہ... کل کا پیار.... آج کی نفرت... یہ حقارت... یہ سب کچھ کیا ہے... ماں نے ایسا کیوں کیا... رخسانہ کا قصور کیا ہے...؟ میں کچھ سمجھ نہ سکا.. میں اُن دنوں چھوٹا تھا... نا سمجھ تھا، بارہ تیرہ سال کا اور رخسانہ تھی

مکمل جواں ــــ!

وقت گذرتا گیا..

میں بڑھتا گیا... میرا شعور بالغ ہوتا گیا... میں بہت سی باتوں سے باخبر ہوگیا۔ مجھے سمجھا دیا گیا کہ رخسانہ سے نفرت کرنا کیوں ضروری ہے... یہ کس جرم کی سزا ہے جو وہ بھُگت رہی ہے... وہ شادی سے پہلے ہی ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ ناجائز بچے کی ماں.... ہمارا سماج سب کچھ معاف کرسکتا ہے۔ مگر یہ گناہ نہیں... یہ سنگین شرم ناک حرکت نہیں۔ اکثر لوگوں کو یہ شکایت بھی تھی کہ وہ اُس ذلیل شخص کا نام، اتہ پتا... کیوں نہیں بتاتی.. جس نے اُسے برباد کیا۔ اُسے داغدار بنایا.... وہ... وہ ذلیل شخص آخر کون ہے۔؟

اسی دوران رخسانہ کے کسی موذی مرض میں مُبتلا ہوجانے کی خبر علاقے میں پھیل گئی۔ محلے کے مرد عورتیں، جوان، بوڑھے... غرض سبھوں نے اپنی اپنی جگہ خوشی کا ڈھول پیٹنا شروع کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سب رخسانہ کے مرنے کے خواہاں تھے۔ مرجائے گی، بھلا سے چھٹکارا ملے گا۔ محلّہ ناپاکی اور گندگی سے پاک ہوگا اور شاید سماج کا کوئی خاص مقصد بھی...

رخسانہ کے کردار کو میں بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مجھے بھی اُس سے نفرت تھی۔ مگر نفرت کا مطلب یہ نہ تھا کہ اُس کا وجود ہی ختم ہوجائے۔ ایک رخسانہ مرتی تو دوسری رخسانہ جنم لیتی۔ یہ آنا جانا آدم کے وقت سے جاری ہے... نام بدلتے گئے، نشان مٹتے گئے... یادیں رہتی گئیں۔ مگر گناہ ــــ گناہ کا انداز نہ بدلا۔ گناہ

وہی ہے۔ گناہ کا آغاز و انجام وہی ہے اور گناہ کرنے کی انسانی فطرت بھی وہی صدیوں پرانے وحشی درندے کی سی ہے....

رخسانہ مری نہیں

البتہ لوگوں نے کہا۔ موت کے دہانے پہ کھڑی ہے۔ کل پرسوں تک ضرور مرجائے گی۔ اگلے دن میں کالج سے لوٹ رہا تھا۔ بڑی دیر ہو چکی تھی... ہر طرف پُر اسرار خاموشی اور بھیانک اندھیرے پھیلے ہوئے تھے۔ اندھیروں میں ہی جذبات اُبھرتے ہیں۔ دنیا کے خوف سے جو میں دن کی تابناک روشنی میں نہیں کر سکتا۔ وہ میں نے اندھیرے میں کر دیا۔ میں کسی انجانی قوت کے زیر اثر رخسانہ کی جھونپڑی میں داخل ہو گیا۔

لالٹین کی مدھم روشنی میں وہ بیٹھی کچھ گنگنا رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو چونکے بغیر ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ لئے مجھے گھورنے لگی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا

"رخسانہ... میں تمہاری خیر و عافیت پوچھنے آیا ہوں۔ کیا حال ہے اب صحت کا...."

"صحت..." اُس نے ہونٹوں کا زاویہ بدل کر طنزاً کہا "تجھے کیا دکھائی دیتا ہے...؟"

مجھے اُس کے چہرے پر بیماری یا پریشانی کی کوئی علامت دکھائی نہ دی.... وہی بھرا بھرا گول گلابی چہرہ.. ہونٹ سوکھے ہوئے مگر تراش خوبصورت اور دو بڑی

بڑی آنکھیں جن میں معنی خیز خاموشی چھائی ہوئی تھی ـــــ یہ خاموشی حسین تھی۔مگر مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی...اس خاموشی نے میرے جذبات اور میری ہمدردی کے احساس کو بے قرار سا کردیا...میں اچانک بڑی اپنائیت سے کہہ اُٹھا۔

''رخسانہ....تم نے کیوں اپنی زندگی تباہ کی۔تمہیں کس کا انتظار ہے۔تُجھے معلوم نہیں لوگ کیا کہتے ہیں...''

''مجھے کسی کی پروانہیں۔'' اُسکا لہجہ ترش ہوگیا'' تباہی میرا مقدر تھا...میرا مقدر....''

''مگر کیوں...؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا...'' تم ایسا کیوں سوچتی ہو۔تم اُس ذلیل شخص کا نام،اتہ پتا کیوں نہیں بتاتی۔جس نے تمہارا جیون برباد کیا۔تمہارا مستقبل داغ دار بنایا......بتاؤ......خدارابتاو......وہ ذلیل شخص کون ہے......؟''

رخسانہ کی آنکھوں میں اچانک نفرت کے شعلے بھڑکے۔کچھ دیر مجھے گھورتی رہی،پھر بول اُٹھی...

''سننا چاہتے ہوتو سنو...وہ شخص..وہ کمینہ..وہ ذلیل انسان تم ہو..تم...تم نے مجھے برباد کیا۔تم میرے بچے کے باپ ہو''

''کیا..؟'' میرے پیروں تلے زمین نکل گئی..ایک لمحہ کے لئے میں سکتے میں آگیا..خوف اور وحشت سے میرا جسم کانپنے لگا...

مکار عورت ـــــ پاگل ہوگئی ہے۔دیکھوتو کیا کہتی ہے۔مجھ پہ جھوٹی

تہمت لگاتی ہے۔ اگر کسی نے سن لیا.... نہیں ...نہیں ... یہ جھوٹ ہے۔ مجھ پر جھوٹا الزام ہے۔ میں گھبرا کر اُلٹے پاؤں لوٹنے ہی والا تھا کہ اُس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی ـــــ ''ٹھہرو...''

میرے قدم خود بخود رُک گئے... مجھے ایسا لگا.. میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا.. آگے بڑھا تو یہ دھرتی نہ رہے گی... آسمان نہ رہے گا۔ میں نہ رہونگا... میرا وجود نہ رہے گا... کچھ بھی نہ رہے گا..... جانے یہ کیسی بے بسی تھی... میں سمجھ نہ سکا..اچانک اُس کی ہنسی میرے کانوں میں گونجی...طنز آمیز ہنسی....!

''تم ڈر گئے... میں جانتی ہوں، تم سب مرد بزدل اور احمق ہو۔ پھر آئے ہی کیوں یہاں ہمدردی جتانے...میں نے تم جیسے بہت سے ہمدرد دیکھے ہیں ـــــ مگر تمہیں... تمہیں کیا ہمدردی ہے مجھ سے... بولو....؟''

میں کچھ نہ بولا...

وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے چلا اُٹھی ـــــ

''چُپ کیوں ہو گئے ـــــ کہو ـــــ کیا ہمدردی ہے تُجھے...؟''

میں پھر بھی خاموش رہا۔ اُس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں احمقوں کی طرح اُس کا چہرہ تکنے لگا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبنے لگی تھی۔ پھر اچانک ہی اُس کے خشک ہونٹ تھرتھرائے۔ اُس نے گھمبیر آواز میں کہا

''کیا محبت کرنا کوئی پاپ ہے؟''

''نہ...نہیں تو....'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا...

وہ مسکرادی ـــــ عجیب سی مسکراہٹ تھی.. عجیب ساز ہر بھرا لحہ تھا.. زندگی میں پہلی بار مجھے اپنی بے چارگی کا احساس ہونے لگا... میں چیخ کر کچھ کہنے والا تھا ـــــ کہ وہ بول اُٹھی۔

''پھر بتاؤ میرا قصور کیا ہے.... میں نے بھی تو محبت ہی کی تھی، تم جیسے بھولے بھالے شریف صورت ماسٹر جی سے...وہ سامنے والے سکول میں پڑھانے آتے تھے... مجھے اپنی جان سے زیادہ چاہتے تھے... ایک شام باتوں میں اُس نے کہا...کل تیار رہنا۔ میں تمہیں اپنے دوست کے گھر لے جاؤں گا، میری ماں اور بہنیں تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں...

اگلے دن میں سج دھج کر گھر سے نکلی۔ ماسٹر جی نے مجھے ایک بوسیدہ سے مکان میں پہونچا دیا..مگر اُس مکان میں نہ تو ماسٹر کی بہنیں تھیں اور نہ اُس کی ماں ہی مجھے دکھائی دی۔ مجھے نامعلوم سا خوف محسوس ہونے لگا۔ میں نے گھبرا کر باہر نکلنے کی کوشش کی مگر ماسٹر جی نے میری تمام کوششوں کو ناکام بنا دیا۔ مضبوطی سے اپنے بازؤں میں جکڑ کر میرا منہ بند کر لیا اور اس طرح میں اُسکی ہوس کا شکار ہوتے ہوئے بے ہوش ہوگئی ـــــ کافی وقت گزرنے کے بعد جب میں ہوش میں آگئی تو اُس کمرے میں صرف ہم دو نہ تھے''

''اور ـــــ'' میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا چیخا..''اور کون تھا اُس کمرے میں....؟''

وہ اپنے آنسو پونچھ کر آہستہ سے بولی...

''ماسٹر جی کے دوست... اُس کے تین دوست ـــــ وہ سب وہاں موجود تھے۔ اب تم ہی کہو۔ میرا لال کس کا بیٹا ہے... مجھے لگتا ہے دنیا کے تمام مرد اسکے باپ ہیں...... کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی میرے بچے کا باپ ہی نہیں ـــــ!''

☆☆☆

دیوتا

وہ اپنی تمام لگن، ہمت اور بہادری کے ساتھ پہاڑ کی ایک ایک چوٹی سر کرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اُس کے ہاتھوں میں سات رنگوں کا ایک جھنڈا تھا.. یہ جھنڈا اُسے پہاڑ کی سب سے اونچی سخت اور خطرناک چوٹی پر گاڑنا تھا۔ راستہ طویل اور دشوار گزار تھا مگر یقین پختہ تھا۔ اپنی دُھن میں جھومتا، مچلتا، اپنی کامیابی کے گیت گنگناتا ہوا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آگے.... اور آگے... بلند چوٹی کی جانب.......

اب اُسکے سامنے آخری پڑاو تھا۔

آخری چوٹی تھی ـــــ اس چوٹی پر جھنڈا گاڑنے کے بعد ہی شمال مغرب، جنوب مشرق... ہر طرف سے لوگ اپنے برہنہ جسم لے کر اُس کی عظمتوں کو سلام کرنے آئینگے اور وہ دیوتا کہلائے گا۔ ننگے شہر کا ملنگ دیوتا....!

اُس کی سانسوں میں کائنات کی سانس ہوگی۔ وہ روحوں کا دوست بن

جائے گا۔ اپنے آنسوؤں سے لوگوں کے خشک خالی پیالے بھر لے گا۔ اپنی جھولی میں چھپائے قرمزی پھولوں سے ننگی عصمتوں کو سنبھالے گا۔ اپنے نورانی پرتو سے سیاہ جھونپڑیوں میں روشن آفتاب چمکائے گا اور بھولی بھٹکی آدم کی اولاد کو زندگی کی ایک نئی سکون بخش سوچ سے متعارف کرائے گا۔ اور.... اور اُس کی ایک دیرینہ خواہش پوری ہو جاتی۔

خواہش کتنی معصوم تھی۔

اور پڑاو کتنا سخت... ایک کمزور دل انسان کے لئے موت... لیکن ایک پُر اعتماد شخص کے لئے محض ایک ارادہ... ایک یقین... ایک لمبی چھلانگ بس...

جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا۔ اُس کے چہرے پر جوش کی سرخی اور قدموں میں تیزی آگئی۔ اب صرف چند میٹروں کا فاصلہ رہ گیا تھا۔

۲۰ میٹر...

۱۰ میٹر...

۵ میٹر... اور منزل کے اس قدر قریب ہونے کی خوشی نے اُس کے جسم میں کپکپاہٹ سی پیدا کی۔ شدید خوشی/شدید تھرتھراہٹ... اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بھی وہ سنبھل نہ سکا۔ اچانک ہی اُس کے ہاتھ سے جھنڈا چھوٹ گیا۔ جھنڈا اُٹھانے کے لئے جونہی وہ جھک گیا۔ اُس کا پیر پھسل گیا۔ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ دوسرے ہی لمحے نیچے پستیوں کی جانب ڈوبتا ہوا ایک گہری کھائی میں گر گیا۔

کھائی میں اندھیرا تھا اور موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ چند لمحے

بعد جب اُسے کچھ ہوش سا آ گیا۔ اور اندھیروں سے اُس کی آنکھیں کچھ مانوس ہو گئیں تو اُس کے منہ سے ایک طویل چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اُس کا سر پیر لرز اُٹھا تھا۔ اُس کے چاروں طرف بے حد خوفناک اور بھیانک چہروں کے انسان تھے۔ وہ سب اُسے گھور رہے تھے اور اطمینان کا گہرا سانس لے کر خاموش قہقہے لگا رہے تھے۔ پھر جب قہقہوں کا زہر اُس نے اپنی رگوں میں سرائیت کرتا ہوا محسوس کیا تو غصے کی شدت سے تلملا اُٹھا۔ اُس نے چیخ کر کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اپنی زبان ہلا نہ سکا کہ اُس کی زبان بند تھی۔ وہ ٹانگیں نہیں ہلا سکا کہ اُسکی ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں، اُس کا جسم مفلوج ہو چکا تھا۔ وہ صرف دیکھ سکتا تھا... بول نہیں سکتا۔ سُن نہیں سکتا۔ اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتا تھا.....

اُس کھائی میں پڑے تمام انسانوں کی حالت ایک سی تھی... سبھوں پر ایک سا جمود طاری تھا۔

خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اُس نے اپنی آنکھوں کو حرکت دی۔

''تم لوگ اس کھائی میں کب سے ہو..؟''

اُن کی بے نور آنکھوں نے مختصر جواب دیا

''پتہ نہیں کب سے ہیں۔ بے شمار موسم اوپر ہی اوپر گزر گئے ــــــ''

''تمہارے جھنڈے کہاں ہیں....؟''

وہ سب مسکرا پڑے۔ کچھ سوچنے لگے

اس بار اُس نے اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھمایا ــــ بات گئے

کل کی تھی لیکن اُن کے حال سے وابستہ۔

''تم...تم لوگ زندہ کیسے ہو...؟''

آنکھیں خاموش اپنے سوگ میں ڈوب گئیں

''مم...میرا مطلب ہے...تم کھاتے کیا ہو...پیتے کیا ہو..؟''

گہرے سناٹے کے بعد جواب ایک سا ملا

''جب پیاس لگتی ہے تو اپنا خون پیتے ہیں۔ جب بھوک لگتی ہے تو اپنا جسم کاٹ کر کھاتے ہیں...اور پھر گہری نیند سو جاتے ہیں....''

اُسنے اُنکے حال پر رحم کھاتے ہوئے سوچا....واقعی اُن کے لئے سو جانا ہی بہتر ہے کہ اُنکی رگیں سوکھ گئیں ہیں۔ اپنا جسم کاٹ کاٹ کر کھانے کی وجہ سے اُنکے جسموں پر گوشت بھی کم ہی بچا ہے۔ وہ ہڈیوں کے خشک خالی پنجر بن گئے ہیں...مذید سانسیں سنبھالنے کے لئے وہ کھائیں گے کیا۔ پئیں گے کیا...پھر اُن کے جھنڈوں کا کوئی نشان تک باقی نہیں.... وہ پھر زندہ کیوں ہیں ___ ؟ کیا یونہی سڑنے، گھلنے اور تڑپ تڑپ کر مرنے کے لئے......؟

نہ معلوم یونہی کتنا وقت گزر گیا۔ کتنے موسم بیت گئے۔ وہ سب اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے سو گئے تھے۔ لیکن وہ جو نیا تھا ابھی جاگ ہی رہا تھا کہ اُس کی رگوں کا خون ابھی تازہ اور گرم تھا۔ اور کافی مقدار میں موجود تھا... یونہی اپنی سوچوں میں جلتا، جاگتا رہا ___ پھر یک بیک اُس کے کان کھڑے ہو گئے۔ دور سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں اور پھر کچھ دیر بعد تین چار آدمیوں کی ایک وردی پوش ٹولی نظر

آ گئی۔

وہ بڑے محتاط انداز میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے.. آگے... اور آگے..

کھائی میں پڑے تمام انسان سوئے ہوئے تھے یا مر چکے تھے۔

لیکن آخری آدمی... سات رنگوں کے جھنڈے کا مالک ابھی زندہ تھا، جاگ رہا تھا... اچانک اُس کے چہرے کی رگیں تن سی گئیں ـــــ جیسے وہ اُنہیں اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ جیسے وہ نہیں چاہتا تھا، کسی دوسرے کا حشر بھی اُس جیسا ہو.... جیسے وہ اُنہیں کہنا چاہتا تھا... آگے بڑھنا ہے تو سنبھل سنبھل کر بڑھو... ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بڑھو... اور حوصلوں اور ارادوں کو قایم رکھ کر بڑھو.....

قافلہ... اپنی دُھن میں مست آگے بڑھتا رہا۔ ... یکا یک ہی وہ سب چونک پڑے... اُن کے سامنے سات رنگوں کا ایک جھنڈا گرد میں لت پت پڑا ہوا تھا۔ اُن میں ایک نے (جو معلم تھا) آگے بڑھکر جھنڈا ہاتھ میں اُٹھا لیا۔ جھنڈے کو غور سے دیکھا... لیکن یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ جھنڈے کا مالک خود کہاں مر کھپ گیا ہے۔ جھنڈے کو اِس مقام تک پہنچانے والا خود کہاں کن کھائیوں میں کھو گیا ہے ـــــ کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔

معلم نے اچانک بُلند چوٹی کی طرف دیکھا...... آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے ساتھیوں کو کچھ سمجھایا اور پھر خود ہی یہ جھنڈا لے کر آگے بڑھنے لگا... فاصلہ اب صرف چند قدموں کا تھا۔

۱۰ قدم... ۵ قدم... اور ۲ قدم.. وہ چوٹی کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ خوشی اور مسرت سے اُنکے چہرے دمکنے لگے۔ پھر جونہی معلم نے چوٹی پر جھنڈا لہرانے کی کوشش کی۔ فضا میں اچانک ارتعاش سا پیدا ہو گیا جیسے اُن کے ہاتھ چوٹی کو چھونے کے قابل نہ تھے۔ دوسرے ہی لمحے چوٹی خود بخود اپنی جگہ سے لڑھک گئی اور چھوٹی بڑی کئی چوٹیوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر لڑکھڑاتی ہوئی اُسی کھائی میں گر گئی۔ جہاں جھنڈے کا حقیقی مالک اپنی ڈوبتی کانپتی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ کر اپنی سانسیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جھنڈا فضا میں معلق لہراتا رہا۔

شہر والے جوق در جوق جھنڈے کو دیکھنے کے لئے آ گئے... جب وہ جی بھر کے جھنڈے کو دیکھ چکے تو اُنہیں جھنڈے کے مالک کا خیال آ گیا۔ پھر وہ دیوانوں کی طرح عظیم دیوتا کی تلاش میں چیختے چلاتے چاروں طرف پھیل گئے لیکن دیوتا بہت پہلے چٹان بوس ہو چکا تھا۔!

☆☆☆

مندر کے اندر کا رقص

(اُن کے نام جن کی محبت نے مجھے ایک قلمکار بنا دیا)

مندر کے اندر کی چار دیواری میں بڑی پُر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی ـــــ چاروں اور رینگتے بھاگتے ہوئے سائے... جو دکھائی نہیں دیتے... صرف اُن کی آہٹیں، آہیں، اُس کے کانوں میں گونجتی جا رہی تھیں...

"میں کہاں پر ہوں....؟"

وہ اچانک خود سے سوال کرتا ہے

بُت مسکرا دیتے ہیں۔

"ہمیں پہچان لو....."

"تم...تم....!" اُسے یاد پڑتا ہے کہ وہ چلتے چلتے یکا یک اِس طرف آ لگا تھا۔ اور باہر پجاری نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا تھا....

"اندر مندر کی مقدس مورتیاں ہیں ـــــ یہ پھول ساتھ لے کر جاؤ اور اُنکے چرنوں میں رکھ آؤ... کہ یہ صرف پتھر نہیں ہیں ـــــ اپنے وقت کی مقدس

کہانیاں ہیں اور پریم ندی بیچ میں بہتی ہوئی ایک ہے...تم دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ پاؤ گے...!''

''کیا...کیا نہیں دیکھ پاؤ نگا....؟''

پُجاری نے جواب نہیں دیا تھا

وہ ایک لمحہ کچھ سوچنے کے بعد ٹوکری میں رکھے ہوئے پھول اُٹھا کر اندر داخل ہوا تھا.......

پھول ـــــ

سرخ.....زرد.....سیاہ....گلابی....سفید...

اُسے پھولوں کے نام یاد نہ تھے، لیکن وہ اُنہیں رنگوں سے پہچانتا تھا ـــــ

اتنے سارے رنگ، اتنے سارے پھول، اپنے ہاتھوں میں پا کر وہ خوش ہوا، اور خوشبوؤں کا حسین احساس لئے ـــــ وہ ایک مورتی کے قریب جا کر اُسے غور سے دیکھنے لگا........

بڑی بڑی خوبصورت خوابوں بھری آنکھیں... بھرے بھرے ہونٹ... چھوٹے چھوٹے ہاتھ...اور ناک جو یوں اُٹھی تھی جیسے چاند کو چھونا چاہتی ہو

''اوہ..!'' وہ یکا یک چونک سا پڑا

یہ ایک مورتی نہیں

ایک خوبصورت چہرا ہے۔ جسے میں دیکھ آیا ہوں، جسے میں نے چھوا ہے، جس کی دھڑکنیں میں نے سُنی ہیں ـــــ مم....مگر کہاں...؟ کس موڑ پر....؟

کس گلی میں....؟

اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

اور یکا یک مورتی کے ہونٹ حرکت میں آ گئے

''تمہارے وہ گیت میرے کانوں میں اب بھی گونج رہے ہیں''

''میرے گیت.....میں کبھی گاتا بھی تھا...!''

وہ حیرت سے بڑبڑایا

مورتی بولی

''تم نے میرے شہر کے سوکھے برتنوں میں پانی بھی ڈالا تھا''

''میں نے...کب...؟''

''تم نے تو کہا تھا...ہم دھڑکن دھڑکن ایک ہیں''

''میں نے کہا تھا...!'' وہ اپنے ذہن پہ زور دینے لگا۔ جیسے کوئی غوطہ خور اپنا کھویا ہوا موتی تلاش کر رہا ہو۔ اُس کے ہاتھ آہستہ سے حرکت میں آ کر مورتی کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی جانب بڑھے اور پھر وہ اُنہیں سہلانے لگا

یک بارگی اُسے ایک جھٹکا سا لگا...اُس کی آنکھوں میں تیز چمک پیدا ہوئی...دوسرے ہی لمحے اُسکے ہونٹ ہلے۔

''ہاں۔۔۔وہ ایک سپنا تھا...ایک خواب..مجھے ٹھیک یاد آ گیا۔۔۔''

''لیکن سپنے تو ہماری زندگی کی اپنی حقیقتیں ہیں۔ ہم جب اُداس ہو جاتے ہیں تو ان ہی حقیقتوں کے سامنے لا کر خوش ہوتے ہیں۔ خود کو تسلی دیتے ہیں۔

بہلاتے ہیں کہ یہ بھی ہم ہی ہیں۔ ہماری ہی زندگی کی کہانیاں ہیں ــــــ تم سڑک کے ایک طرف سے آ کے مجھے دوسرے راستوں میں کھڑا پا کے مسکراہٹوں کے پھول دیتے تھے اور میں شرما جاتی تھی ــــــ تمہیں یاد نہیں ہے کیا...؟"

"مجھے کچھ بھی یاد نہیں ــــــ میں خواب کو دہرانا نہیں چاہتا"

"کیوں ــــــ؟"

"کیونکہ ہمارے راستے تب بھی جدا تھے۔ آج بھی جدا ہیں۔ ہم ندی کے دو کنارے ہیں اور سفر یہی ہے بھول جاؤ تم بھی.."

"میں... میں نہیں بھول سکتی وہ دن..."

اُس کے خوبصورت چھوٹے ہاتھ ہواؤں میں پھیل گئے۔ جیسے وہ اُسے اپنے بازوؤں میں بھرنا چاہتی ہو۔ جیسے وہ اُس کی ساری پیاس آج پی لینا چاہتی ہو لیکن وہ پرے ہٹ چکا تھا اور اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے پھولوں کو دیکھتے ہوئے.... وہ اُسے کن انکھیوں سے دیکھنے لگا...

وہ روٹھ گئی تھی... اُس کی آنکھیں بُجھ چکی تھیں... اُس کے ہاتھ پیر اپنی جگہ پر آ کے ساکت ہو چکے تھے اور اُس کی اَدھ کُھلی آنکھیں اب آہستہ آہستہ بند ہو رہی تھیں۔

پھر جب وہ دوبارہ ایک بے جان مورتی بن گئی... تو کچھ سوچ کر... آہستہ سے قدم اُٹھا کر وہ اُسکے قریب آ گیا اور سارے پھول اُس کے قدموں میں ڈال دئے... پھر واپس مُڑنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک سرگوشی ہوئی پھر ایک شور سا اُٹھا

مندر کے اندر کی دیواریں چیخ اُٹھیں... ساری مورتیاں ایک ساتھ چلاّ پڑیں۔

پھر اُسے عجیب قہقہے سنائی دے...اور پھر کئی طرح کی آوازیں ——

'ہو.... ہے... ہا...'

'کہاں جا رہے ہو....؟'

'وہاں بھی ہم ہی ہیں....'

'ہم وقت کی اپنی کہانیاں ہیں...'

'ہو... ہے... ہا... مارو...'

'مارو اسے...'

''یہ جھوٹا ہے...'

'دغاباز ہے...'

'فریبی اور مکار ہے...'

''نہیں —— یہ جھوٹ ہے.... میں فریبی نہیں ہوں —— میں دغاباز نہیں ہوں...''

اُس نے حلق پھاڑنے والی آواز میں چلاّ نا چاہا.... لیکن اُس کی آواز اُس کے اندر ہی دب کے رہ گئی... اُس نے اپنی نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں —— باہر نکلنے کے سارے راستے بند ہو چکے تھے.... کہ مورتیاں رقص کرتی ہوئیں اُسکے قریب آ رہی تھیں... اور قریب تر آ کر اُس کے کپڑوں کے چیتھڑے اُڑانے لگیں۔

وہ کس کس کو روکتا ____

ایک ہاتھ رُکتا...

تو پھر دوسرا ہاتھ اُٹھتا...

اور تیسرا... اُس کی جانب بڑھتا...

پھر جب سورج اپنی شام کی دھڑکنیں گننے میں محو تھا ____ تو پجاری جی اچانک چونک سا پڑا۔ اُسے خیال آیا اُس شخص کا جو دھوپ میں پھول لے کر اندر گیا تھا

وہ... وہ ابھی تک... کیوں نہ لوٹا

وہ خود ہی اُسے دیکھنے اندر چلا گیا

مندر کے اندر سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ لیکن وہ شخص آس پاس کہیں بھی نظر نہ آیا۔ وہ اُسے ادھر اُدھر تلاش کرنے لگا ____ پھر اچانک ہی چلاّیا...

"اے... اے شخص.... اے اجنبی... تم کہاں ہو.....

کہاں ہو ____؟"

اُسے کوئی جواب نہ ملا... وہ لمحہ بھر کیلئے حیران سا رہ گیا

پھر بڑی خاموشی سے باہر نکل آیا.......

☆☆☆
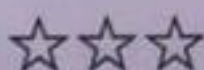
آنگن میں وہ

عجب دھند کا ہے سماں دوستو
میں کس دیپ کا ہوں دھواں دوستو

میں حیران ہوں
وہ بھی حیران ہے
کون ہے وہ ___؟

آؤ کتاب کھول دیں
کہاں سے وہ آیا
کہاں جارہا ہے...
کیا لے کے ___ اور کیا کچھ دے کے...؟

گیارہ ہزار سورجوں سے پہلے کی بات ہے۔ تب وہ نہیں تھا۔ آج ہے اور کل....کل...!

کہانی یوں سنائی جا رہی ہے...

ایک جسم نے دوسرے جسم کی آگ چھو لی

ایک شعلہ لپکا ___

ایک لذت آمیز لمحہ مہکا...

ایک سسکی... ایک صدا

ایک آہ... ایک کراہ... اور پھر ایک جسم کا پیٹ پھولنے لگا اور دوسرے جسم نے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر کچھ نئے خواب بُنے... کچھ کہانیاں جوڑ دیں... اور کچھ رنگ بھی چُرائے...

وقت تھا کہ ٹھہرا نہ تھا

آنکھ تھی ___ کہ کھوئی نہ تھی

وہ تھا.... کہ شکمِ مادر میں تھا ___ جاگا نہ تھا ___ ابھی..

.پھر... ایک روز

ایک سورج کی آمد پر... گلی کا دروازہ آہستہ سے کھُلنے لگا ___ کچھ منتر کچھ کلمات ہونٹوں پر تھرکے.. اور کہیں کسی اجنبی جہاں میں ایک گاین ہوا ___

یا پھر کسی سمندر میں کوئی طوفان اُٹھا

یا پھر کسی کی آنکھیں ٹپ ٹپ برکھا برسانے لگیں

...ایسا ہی کچھ ہوا تھا

آہیں ___ کراہیں... صدائیں

اور پھر ایک ننھی سی چیخ ـــــــ چیں....!

پھر وہ ننھے ہاتھ پیروں سمیت اس زمین پر تھا ـــــــ کس نے اُسے اپنی چھاتی سے لگایا تھا ـــــــ کس نے اُس سے کہا تھا....تمہاری آمد ایک معنی ہے ـــــ کس نے اُسے کہا تھا...تم بھی ہواس بھرے آنگن کے رنگ رنگ پھولوں میں ایک پھول

کسی نے بھی نہیں کہا تھا

یا وہ کہنا چاہتے تھے

لیکن کچھ سوچ کر چُپ رہے تھے

اور پھر وہ چار ٹانگوں سے تین ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ پھر دو ٹانگوں سے چلنے لگا۔ دیکھتا رہا...موسم موسم

اور وہ موسموں کی دُھن سے گھبرا گیا۔

پوری طرح گھبرایا نہ تھا۔ کہ کوئی تلاش.. کسی کی ننھی سی دھڑکن ...کوئی خواب اُسکے ساتھ تھا...اور وہ اُس ایک خواب کے فریب میں موسم موسم اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا چلا گیا..

ہواؤں نے گیت گائے ـــــــ

کتنے رنگ بدلے...

کتنے روپ دکھائے...

جانے والوں کی طرح ـــــــ اُس نے بھی اپنے اپنے وقت پہ جانا ـــــــ

پہچانا____اور مانا.... کہ کہنے والوں نے جو کہانی سنائی....

اُسمیں جو کسی گاین کا ذکر تھا____وہ کیوں تھا

اُس میں جو کسی طوفان کا شور تھا____ وہ کیسا تھا

اسمیں جو کسی کے آنسوؤں کی دیوانی کہانی تھی

وہ کیا تھی____؟

تو پھر کیا یہ جنم____یہ تخلیق____ ایک آنسو کی تخلیق تھی

اُف...وہ کتنا رویا ہے۔ کتنا تڑپا ہے۔ کتنا مچلا ہے...اور بے رحم آکاش نے____اگن اگائی...اندر باہر....اِک عجیب

ہاں آنکھ کو اُلجھانے کے لئے کہیں سے یہ آواز آئی...آنگن کے یہ دوسرے بھی تیرے اپنے ہیں...انہیں دیکھو..اور دیکھو...دُکھن کی تہیں کتنی گہری ہیں

اور دیکھو____ پیاس کی اگن کتنے یگوں کی ہے

اور دیکھو____چال کی چُبھن کتنی نوکیلی ہے

اور دیکھو____ اور مت دیکھو......

اور دیکھو.....اور غور کرو....

اور غور مت کرو

پاگل ہو جانے کا خطرہ ہے

میں حیران ہوں

وہ بھی حیران ہے

کون ہے وہ ــــ؟

اب وہ آنگن کی ایک میزان پہ کھڑا ہو گیا ہے

میزان ایک طرف نہیں ہوئی

کہ دوسری طرف وزن برابر ہے

وہ مسکرانا چاہتا ہے.... نہ معلوم کس بات پر...!

لیکن مسکراہٹ کسی کی مٹھی میں قید ہے

وہ رونا چاہتا ہے

چیخنا، چلاّنا چاہتا ہے۔ گانا چاہتا ہے

لیکن آواز کے بدن پر کالا کوئی لہرا رہا ہے

وہ یار دوستوں سے کہنا چاہتا ہے

'یہ جیون ہے یا موت....'

یار دوست چُپ ہیں

لیکن ایک یار اپنی آواز اُگل ہی دیتا ہے

"یہ جنگل پُر اسرار ہے۔"

"ہاں۔ یہ جنگل پُر اسرار ہی ہے۔ تم بھی ہو میرے لئے ــــ اور میں بھی تمہارے لئے..."

وہ کہتا ہے

آگے بڑھتا ہے ــــ اور پھر سب کچھ بھول جاتا ہے

رات ایک نئے سورج کو لے آتی ہے، وہی دن....وہی دھوپ.........

اور وہی دوڑ.....

میں اُسے دیکھ رہا ہوں...سرخ زرد پہاڑوں کے بیچ کھڑا.....کچھ سوچتا

ہوا، کچھ سہما ہوا سا

آنگن میں اُس نے کئی کہانیاں سنی ہیں

سورجوں کی

رسولوں اور پیغمبروں کی

اور ماں کے اچھے اچھے بیٹوں کی.....

فخر زمین

فخر آسمان

اچھے اچھے ــــ بہت شاندار....

وہ اپنے اندر سے نکلی ہوئی راہ روک نہ سکا...اور پھر روکتا بھی کیسے...

پھر اُس نے آنگن میں دوسری کہانیاں سنیں

اندھی دلدلوں کی

تاریک گپھاؤں کی

موت کی...

آئینوں میں ناچتے لہراتے ہوئے سانپوں کی

ٹوٹے سپنوں کی

ایک اور روپ کتاب کا

اور کتنا سچا...

اور پھر وہ اُن منظروں سے ڈر ہی گیا

ڈرو مت دیکھو... وہ سب آنگن میں آنے کی آگ پی چکے ہیں۔ تم کو بھی پینی ہے اور خاموش پینی ہے اور ہنس ہنس کر پینی ہے ـــــ وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے

فیصلے کرتا ہے

اور اُس کے بدن کی بولتی ہوئی بلّی کو خاموش بھی کرنا چاہتا ہے کہ جنم کی پہلی چاہ تھی ـــــ جیون کا ایک سُریلا میٹھا گیت......

لیکن وہ یہ گیت سُن نہیں پاتا ہے

سہم جاتا ہے... اپنی سوچوں میں کھو جاتا ہے، اندھی دلدلوں میں قید سا ہو جاتا ہے۔

وہ اپنے آپ سے باتیں کرتا ہے

'یہ قید خانہ نہیں تو یہ کیا ہے؟

کیا ہے ـــــ؟'

وہ چیخ اُٹھتا ہے

اور اُسکے اندر سے ہی آواز آتی ہے

'یہ تم کیا کہتے ہو.... اتنی بڑی دنیا ــــــ یہ وسیع کھیت... یہ میدان... یہ جھرنے... یہ پہاڑ، یہ پارکیں... یہ فضا... یہ پھیلا آکاش.... تم اسے، اتنی بڑی خدا کی دنیا کو قید خانہ کہتے ہو'

'پھر یہاں یہ گھٹن سی کیوں ہے۔؟'

وہ پوچھتا ہے۔ اور اُسے کوئی جواب نہیں ملتا ہے

پنجرے میں دیکھے ہوئے کسی پرندے کو یاد کرتا ہے... خود پر ایک نظر ڈالتا ہے... اور پھر ایک مری مری سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لے آتا ہے...

یہ کتاب ہے۔ اور اس کا ساتھ کسی بھی صورت میں دینا ہے۔ اور دیتے رہنا ہے۔ میں حیران ہوں۔ وہ بھی حیران ہے۔ ہے تو وہ کون ہے آخر ــــــ ؟

اور پھر وہ اپنی کتاب دور تک پھیلا دیتا ہے... آنے والے سورجوں کی آمد پر خوش آمدید کہتا ہوا.... بہت آگے تک چلا جاتا ہے

اُس کے چہرے کی داڑھی جو سیاہ تھی

سفید ہوتی جارہی ہے

اُس کا چہرہ جو زرد تھا

گہرا زرد ہوتا ہوا سوکھا پتا ہو جاتا ہے ــــــ

ــــــ اور پھر پتا شاخ سے ٹوٹ جاتا ہے

مٹی میں گُم ہو جاتا ہے

مر جاتا ہے ___ فنا ہو جاتا ہے تو پھر زندہ رہنے والا کون ہے ___

کون ہے؟

میں حیران ہوں

وہ بھی تو حیران ہی ہے

کون ہے وہ آخر.....؟

☆☆☆

عبادت

وہ....کافی دیر سے مندر میں

کرشن مہاراج کی مورتی کے سامنے سر جھکائے بیٹھا اپنی پوجا میں مگن تھا۔

اتنے میں کسی نے چپکے سے اُس کے کان میں کہا____

''تمہارے جوتے...چُرا لئے گئے ہیں''

''میرے جوتے...کل ہی جو میں نے خریدے تھے۔ میرے نئے جوتے....''

چونک کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا

اور پھر تیزی سے باہر نکل آیا اور اپنے جوتے تلاشنے لگا

جوتے اپنی جگہ پر بدستور موجود پا کر اُس نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا

اپنے جوتے اُٹھائے۔ بغل میں دبائے اور پھر سے مندر میں آ کر اپنی عبادت میں لگ گیا۔

اب اُس کے سامنے کرشن مہاراج کی مورتی نہ تھی۔

صرف دو جوتے تھے۔!!

☆☆☆

اے محبت تیرا انجام....!

پتھروں کے شہر میں.... بے رَس ہواؤں کے بیچ کھڑا تاروں بھرے آکاش کی چاندنی کو تک رہا ہوں۔ زرد زرد مری مری سی چاندنی ہے...لیکن کل یہ ایسی نہ تھی

کل یہ جوان تھی.......

ایک حسین خواب کی کہانی تھی...شرمیلی اور شوخ تھی۔ اور یہ تم جیسی تھی لیکن کل ـــــ

کل کتنے یگوں کا نام ہے....تم جانتی ہو

کل کتنی دنیاؤں کی دھڑکن ہے

تمہیں معلوم ہے....اور یہ کل کیسا فریب ہے

تمہیں سب معلوم ہے... یہ کل میری ہستی بھی ہے اور یہ کل میری پہلی محبت بھی ہے۔ کل جو میرا تم سے رشتۂ دل تھا!!

کیا ہوا ـــــ کسے آواز دوں....کسے کہوں...میرا دوش کچھ بھی نہ تھا۔ ہم ملے...ہم بچھڑے...عجب ہوائیں تھیں وہ۔ آ کے پھول کھلا گئیں ـــــ اور پھر دھول اُڑا گئیں...اور پھر دو جہانوں میں دو بچپن ٹوٹ گئے۔ دو کہانیاں بکھر گئیں

—— دو دل جو ایک تھے۔ ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ جدا ہو گئے

کیسی ہوائیں تھیں وہ....؟

چاندنی چھپ گئی ہے

لیکن میرے اندر سے میری چاندنی گہری دھند سے باہر نکل آ رہی ہے —— اپنا گھونگھٹ کھول رہی ہے۔ شرما رہی ہے اور جیسے کچھ کہہ رہی ہے

یہ تم ہو —— تمہارا بچپن ہے

یہ میں ہوں —— میرا گیت ہے

یہ تم ہو —— تمہاری معصومیت ہے

یہ میں ہوں —— میرے چاچا کے کھیت ہیں۔ یہ بہتا ہوا جھرنا.... یہ روانی پانیوں کی ہمارے گاؤں کی کہانی ہے۔ یہ تمہاری آواز ہے

"کیوں رے میرا انتظار کیوں نہیں کیا.."

میں مڑ کے دیکھتا ہوں۔ میری چاندنی کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ ایک لکھی ہوئی تختی سمیٹے ہوئے ہیں اور کندھوں پہ چھوٹا سا کتابی بستہ...اور ہونٹوں پر وہی شوخ سی مسکراہٹ...

میرا دل بلیوں اُچھل پڑتا تھا۔ جب تم کسی بات پر روٹھتی یا شکایت کرتی تھی —— ایسا کیوں ہوتا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا... یہی کوئی دس گیارہ سال تھی ہماری عمر اُن دنوں...

"چپ کیوں ہو۔ میری بات کا جواب دو"

تم نے قدرے اونچی آواز میں کہا...

اور میں نے تمہیں چھیڑنے کے لئے کہا

''میں کیوں کرتا تمہارا انتظار...''

''کیوں ـــــ'' تم روٹھ سی گئی۔ ''میں نہیں کرتی ہوں تیرا انتظار...''

''کیوں کرتی ہو میرا انتظار...؟''

مجھے تمہیں چھیڑنے میں عجیب سی مسرت محسوس ہو رہی تھی۔ تم نے بے ساختگی کے ساتھ کہا

''مجھے اچھا لگتا ہے۔ تمہارا انتظار کرنا...''

میں نے اپنی کہی

''اور مجھے بھی یہ سب کچھ... یہ ملنا، بچھڑنا... یہ روٹھنا۔ منا.. یہ انتظار کرنا اچھا لگتا ہے... ایسا کیوں ـــــ روحی ایسا کیوں ہوتا ہے...''

تم نے جواب نہ دیا.... کسی خواب کی خاموش گدگدی محسوس کی

میں نے بھی کچھ نہ کہا۔

کھو گیا ـــ اپنے ہی اندر کے کسی اَن دیکھے جہاں میں...... جہاں تم تھی، صرف تم... اور تمہاری میٹھی میٹھی مسکراہٹیں... باتیں اور....

خواب ٹوٹ گیا ـــــ

بچپن۔ اپنے انہی رنگوں... انہی کہانیوں اور انہی راستوں میں کہیں پیچھے بچھڑ گیا... میں دیکھ رہا ہوں... میرے سامنے.... گلابی... گلابی.. سراپا گلاب ـــــ

اور میں تیرا وہ پرستار ـــــ جس کی دھڑکنوں میں تم نہ جانے کب سے کروٹیں لے رہی تھیں ـــــ شاید میرے جنم دن سے پہلے ہی...

یہ کیسے لمحے ہیں... تم چنار کے پتوں کی مدھم سرسراہٹ میں میرے قریب بیٹھی میرے بالوں سے کھیلتے ہوئے کہیں کھو گئی۔ اور پھر اپنے ہی کسی خیال سے چونک اُٹھی۔ اچانک پوچھا ـــــ

''تم مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے''

''پگلی۔ مجھ پہ تمہیں بھروسہ نہیں۔ میری زندگی، میری دنیا... میری دھڑکن تم ہو صرف تم...''

تمہارا سر آہستہ سے جھک گیا۔ ایک خواب ایک یقین، ایک ساتھی تم نے پالیا تھا......

اور میں سوچتا... واقعی وہ دن، وہ لمحہ کتنا خوبصورت اور دلفریب ہوگا۔ جب تم میری خواب گاہ میں اپنی نہ ختم ہونے والی باتیں چھیڑ دے گی۔ کل کی ـــــ آج کی اور آنے والے کل کی ـــــ آنگن کے پھولوں کی ـــــ اپنے بچوں کی.....

مگر اُس دن سے پہلے ہی ایک عجیب سا دن آ گیا۔ تم میری خواب گاہ میں نہ تھی۔ پرانے راجاؤں کے کھنڈروں میں ـــــ بارش سے سمٹی سمٹائی، میرے قریب تھر تھر کانپ رہی تھی

ہم کھیل کھیل میں کتنا آگے چلے آئے تھے۔ ہم بھول ہی گئے تھے کہ بادل کالے ہیں اور ہمارے پیچھے ہمارا گھر ہے۔ ہماری دنیا ہے ہمارا اپنا گاؤں ـــــ

گاؤں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ ہم سب کچھ بھول گئے تھے... سب کچھ ہی....

تمہارا بدن تھر تھر کانپ رہا تھا

لیکن شعلوں کی زد میں مجھے لیتا ہوا... کہیں اور کسی آگ کی جانب بُلا رہا تھا

وہ آگ کیا تھی ــــ؟

وہ آگ تم تھی ــــ ہاں روحی..... تم...... جو مجھے بُلا رہی تھی ــــ

قریب... اپنے قریب... بہت قریب.....

ایک بجلی کڑکی۔ تم ڈر گئی.... ایک پرندہ اچانک پھڑ پھڑایا... میں کانپ سا

اُٹھا... تم مجھ سے لپٹ گئی۔ میں تم میں ڈوب گیا ــــ ڈوب گیا...

سمندر کتنا گہرا ہے یہ پریم کا

ہمارے جسم ٹھنڈے پڑ گئے... ہم بے ہوش ہوتے ہوئے ہوش میں

آ گئے...... میں زرد گھاس سے کھیلتا ہوا.... تمہیں کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا ــــ

تم شرما رہی تھی۔ کھوسی گئی تھی۔ کچھ اُداس سی ہو گئی تھی...

میں نے تمہیں سنبھالا دیا ــــ کہا

"روحی، مجھے معاف کر دینا جو کچھ ہوا، انجانے میں ہوا۔ آخر تو تم میری

ہی ہو"

تم نے خاموشی سے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی

وہ رات ــــ ہمارے ملن کی پہلی رات تھی.... بیت گئی.

اور بھی کچھ راتیں آئیں، گذر گئیں...

پھر یکا یک ہی شادی کے لئے تمہارا اصرار بڑھ گیا

لیکن یہ ہماری خوش قسمتی ہی تھی... کہ جلد ہی گھر والوں نے ہماری شادی کی ایک تاریخ مقرر کرلی۔

ایک روز میں نے کہا ''اب تو میری جان تم خوش ہونا...؟''

تم نے جواب دیا —— ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ میں واقعی بہت مسرور ہوں ——''

پھر تم نے شادی کے اپنے زیورات کا ذکر کیا۔

اور میں نے کپڑوں کا... پھر ہم نے وعدہ لیا کہ ہماری ملاقات اب شادی کی رات کو ہی ہوگی —— کہ دنیا ہے، سماج ہے، ایک پہرا ہے... جواب صرف چند ہفتوں کا ہے

ہم نے آپس میں وعدہ کیا اور بچھڑ گئے...

لیکن پھر اچانک ہی یہ کیا ہوگیا... کیسے ہوگیا... میں ہی ہوں... ہاں میں ہی... تمہارا خواب... تمہاری دنیا بسانے والا تمہارا محبوب... تمہارا راگی... تمہارا عاشق.... جو چیخ رہا ہے تمہاری ماں کے سامنے...

''ہاں۔ میں کہتا ہوں، نہیں ہوگی —— نہیں ہوگی یہ شادی...''

''مگر بیٹا.. کیوں... ہم سے کیا قصور سرزد ہوا''

تمہاری ماں گڑگڑانے لگی... تم پردے کی اوٹ میں تھر تھر کانپنے لگی —— تمہارا بابا چھوٹی چندھیائی آنکھوں سے منہ کھولے مجھے دیکھتا رہا —— تمہارا

بھائی خونخوار نظروں سے مجھے گھورنے لگا ـــــ لیکن مجھے کسی کی پروانہ تھی... میں گھر سے ہی غصے سے بھرا ہوا نکلا تھا... میں نے بڑی ہی بے رخی کے ساتھ کہا

''ہاں میں کہتا ہوں... یہ شادی نہیں ہوگی.. تم نے کیا سمجھ رکھا ہے اپنے آپ کو... (اپنے خاندان کو)۔ کیوں بے عزتی کی میرے والد صاحب کی...''

''بیٹا... یہ تم کیا کہہ رہے ہو...'' تمہاری ماں نے نحیف سی آواز میں کہا

تمہارے والد نے پہلی بار زبان کھولی...

''بیٹے... تمہیں کچھ غلط فہمی ہوگئی ہے....''

''ہونہہ غلط فہمی.... میں جانتا ہوں.. چمراک خاندان والوں کے چونچلے... لیکن میں نے بھی فیصلہ کیا ہے۔ تمہارا یہ خاندانی غرور میں خاک میں ملا دونگا۔ یہ شادی اب نہیں ہوگی''

میں پیر پٹک کے کمرے سے باہر نکل آیا... آج مجھے ہنسی آرہی ہے۔ اپنے اُس لمحے کی دیوانگی پر... اور اپنے فیصلے پر...

پھر روحی ـــــ میں جان نہ سکا کہ تم پر کیا بیتی۔ تمہارا دل کن کھنڈروں میں تبدیل ہوگیا... تیرے سپنوں کا شیرازہ بکھر کر کیا ہوا۔ میرے لئے تو میری اپنی بستی۔ میرا گاؤں بے معنی ہوگیا۔

میں شہر چلا آیا۔ اور کالج میں داخلہ لیا۔ تمہیں بھول جانے کے لئے... یا پھر خود اپنی ذات بھلانے کے لئے...

ماضی میرے پیچھے تھا ـــــ میرا کل تھا

شہر میرے سامنے تھا ـــــــ میرا آج تھا۔ حال تھا... اور پھر حال کی رنگینیوں میں... میں بہہ گیا

ایک ... دو... تین... کتنے ہی شعلے مجھے آگ دے گئے ـــــ کتنے ہی شعلے مجھے راکھ کر گئے۔ مجھے کچھ یاد نہیں... ایک دھند تھی کہ میں جس میں قید تھا۔ ایک عذاب تھا کہ جو مجھ پر مقدر ہو چکا تھا...

تم جاننا چاہتی ہو ـــــ وہ عذاب کیا تھا...؟

وہ عذاب تم تھی۔ روحی... وہ عذاب میں تھا... میرا ماضی تھا... میرا وہ ضمیر تھا.. جو مجھے رہ رہ کے کہہ رہا تھا

تم نے زیادتی کی... تم نے قتل کیا... ایک معصوم زندگی برباد کی...

نہیں ـــــ ! میں چیخ اُٹھتا۔ اور اپنی اِس آواز سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا۔ پہاڑوں اور ویرانوں میں گھومتا۔ پھر اچانک دل میں موت کی آرزو جاگی لیکن موت اتنی مہربان کہاں ہے۔؟

کچھ سنبھلا۔ بیتے ہوئے موسموں کو یاد کیا۔ کئی برس بیت چکے تھے اب تم ماضی کی ایک بھولی ہوئی سی کہانی بن گئی تھی۔ مگر تم کیسی ہو... کیا تم نے شادی کی ہے... کیا تمہیں اب بھی میرا انتظار ہے... کبھی کبھی میں سوچتا... نہ معلوم کیا کیا...؟

کالج کی ڈگری میرے جیب میں تھی۔ میں بچپن کی بھولی ہوئی بستی میں شہر سے واپس لوٹ آیا تھا...

دھوپ بڑی تیز تھی..

میری بستی کی اپنی ڈگر تھی۔ میں اچانک تمہیں دیکھتا ہوں۔ ہاں تمہیں... مگر یہ سچ ہے۔ میں تمہیں پہچان نہیں پا رہا ہوں ـــــ یہ تم ہو... یہ تم نہیں ہو... یہ ایک مردہ سا جسم ہے... ایک سوکھا ہوا پیڑ ہے... وہ سبزگی... وہ زندگی... کہاں گئی تیری... کس چور نے چُرائی... کون ہے وہ لُٹیرا... میری جان کچھ تو کہو... اُس خونی کا نام تو بتاؤ...؟

تم ہنسی ـــ بہت دیر تک ہنستی رہی

میں رویا ـــــ بہت دیر تک سسکتا رہا

اور پھر ہم بچھڑ گئے ـــــ

کچھ روز بعد پھر ملے ـــــ

میں نے ڈرتے جھجکتے ہوئے کہا

''روحی میں اپنے کیے پر شرمسار ہوں، چاہو تو اپنی بے روح لاش مجھے سونپ دو، مجھ سے شادی کرو''

''نہیں.... ہرگز نہیں'' تم نے صاف انکار کر دیا

میں تمہیں حیرت سے دیکھتا رہا۔ تمہاری آنکھوں میں نفرت کے شعلے بھڑکے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تو چل دی

تمہارے انکار نے مجھے خامشی کی ایک گہری کھائی میں قید سا کر دیا۔ پھر میں تم سے جب بھی ملا خود کو خاموش اور کھویا ہوا سا پایا۔ ادھر گھر والوں نے ایک اور لڑکی کے ساتھ میری شادی کر دی۔

اوراب وہ میری ایک بچی کی ماں ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ مگر میں.... میں آج بھی بکھرا ہوا سا ہوں...

بیچ ندی کے اُس پتھر کی طرح ہوں۔ جو لہروں کے تھپیڑے میں بہتا ہے، بہتا ہے.. سوچتا ہے۔ سنبھلتا ہے۔ روتا ہے۔ سسکتا ہے۔ اور کبھی ہنستا بھی ہے۔ اُن کہانیوں پہ... جو ہمارا ماضی ہے... جو تم ہو.. جو میں ہوں... جو ایک یاد ہے... کاش ایک بار ـــــ (ایک حسرت ہے) کاش ایک بار تم کہتیں... جو ہوا. وہ تو ہونا ہی تھا۔ کہ ایک کتاب ہے.. جسکے ہم حروف ہیں، کردار ہیں، جو سٹیج پہ اپنے اپنے لمحوں پر آتے ہیں ـــــــ دور چلے جاتے ہیں... ملتے ہیں... بچھڑتے ہیں..

گیت گاتے ہیں اور پھر بھول جاتے ہیں... ہم میں سے کوئی دوشی کیسے ہے ـــــ کیسے ہے....؟

ـــــ کاش ایک بار تم.....!

☆☆☆
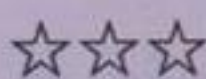
کشمکش

دریا میں مچھلیاں.... •

اور مچھلیوں کے بیچ جنگ یگوں سے جاری ہے۔ سیاہ مچھلی سفید کی کاٹ میں.....زرد مچھلی سبز کو پیٹ میں اُتارنے کی کوششوں میں مصروف....اور لال مچھلی کچھ تلاشتی، اُچھلتی، ناچتی ہوئی...

دریا سفر پر نکلا ہے اور بھی کئی دریا دوسرے علاقوں سے آگے بڑھ رہے ہیں.....دریا....دریا ملتے ہیں۔ ایک دوسرے میں گُم ہو جاتے ہیں۔ کنارے کنارے...اپنی کہانی..اپنی روانی جاری رہتی ہے۔

دریا نے ایک موڑ کاٹ لیا ہے

سفید مچھلی سر نکال کے منظر چراتی ہے۔ دور سنہری مچھلیوں کے چمکیلے بدن للچاتے ہیں۔ اُسے اپنی جانب بُلاتے ہیں۔

وہ آگے بڑھنے کی چاہ کرتی ہے۔ کچھ آگے بڑھتی ہے اور فوراً ہی کہیں سے سیاہ مچھلی نکل آتی ہے...... دیوار بن کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے

''میرا راستہ نہ روکو...آگے جانے دو'' ایک التجا سفید مچھلی کی

''میرے ہوتے ہوئے ایسا ناممکن ہے'' جواب سیاہ مچھلی کا صاف

''تمہارا مطلب ہے؟''

''میرا مطلب ہے جنگ''

جنگ چھڑ جاتی ہے...سیاہ مچھلی کے پاس تمام جہاں کے حربے ہوتے ہیں اور سفید مچھلی معصومیت کی تصویر...... چُپ سی آگے بڑھتی ہے ـــــ جنگ تیز ہو جاتی ہے

جیت سیاہ مچھلی کے حصے میں آتی ہے۔ سفید مچھلی تھکی ہاری، لہولہان، زخموں سے چور... واپس اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹتی ہے اور دور دریا میں للچانے والی مچھلیوں کے رقص کرتے ہوئے بدن اب بے منظر ہو جاتے ہیں... کچھ بھی نظر نہیں آتا اُسے.....

○

مچھلیوں کے بیچ یہ جنگ یگوں سے جاری ہے ......سورج تماشائی ہے ..دریا سفر میں ہے اور صدیوں سے .... سمندر میں گُم ہو جانے کی چاہ لئے رواں دواں.......

مچھلیاں جو ٹوٹی ہیں۔۔۔زخمی ہوئی ہیں۔۔۔آدھے راستے سے لوٹ آئی ہیں...(دریا سوچتا ہے)

کیا انتقام لیے بغیر ہی خاموش ہو جائیں گی

یونہی بے موت مر جائینگی۔۔۔کیا.......؟

☆☆☆

ــــــــــــــــــــــــ سیوِیچ بورڈ کے نمبر

میری کالی گول کوٹھری کے اندر جو سویچ بورڈ لگا ہوا ہے۔ اُس پر مختلف قسم کے نشان اور نمبر لگے ہوئے ہیں

۱....۲....۳

۴....۵....۶

اور

۷....۸....۹

برابر نو سویچ ہیں

نو داستانیں اور نو جدا کہانیاں لئے

پتہ نہیں ـــــــ کون ہے وہ؟

اُس سیاہ کوٹھری کے اندر بیٹھا... جو یہ نمبر تبدیل کر دیتا ہے۔ اور پھر نمبر تبدیل ہونے کے ساتھ ہی سامنے کا منظر بھی بدل جاتا ہے

ابھی ابھی میرے کانوں میں ہلکی سی آواز آئی... کرچ ــــــ میں نے جان لیا۔ کوٹھری کے اندر بیٹھا اجنبی سوئچ بورڈ کے ساتھ چھیڑ خوانی کر رہا ہے۔ پھر اُس نے سوئچ بورڈ کا نمبر تبدیل کیا۔ اور نمبر جونہی تبدیل ہوا میری آنکھوں کے سامنے کا منظر بھی بدل گیا۔

دھوپ جو ابھی مجھ سے لپٹی تھی۔ سیاہ رات میں تبدیل ہو گئی ــــــ اور کہانیاں... ساری کہانیاں... میرا سارا گیان، ہوا کے شکم میں گم ہو کے رہ گیا اور پھر یکا یک ہی ایسا ہوا۔ تاریک گلی سے عجیب سا لباس پہنے پرچھائیاں باہر نکل آئیں اور پھر اپنی وحشتوں کا ننگا ناچ ناچنے لگیں.. چیخنے چلانے لگیں ــــــ زور زور سے قہقہے مارنے لگیں...

میں نے اپنے کانوں پر اُنگلیاں رکھ دیں

خوف اور ڈر کے مارے میرا سارا وجود تھر تھر کانپنے لگا، پھر یکا یک ہی میں نے محسوس کیا۔ شک کے پیڑ کا پھل پک گیا ہے۔ زہر رِسنا شروع ہوا ہے اور میرے اندر باہر یہ زہر تیزی سے پھیل رہا ہے... پھر نیم دیوانگی کی حالت میں یہ زہر میں نے کس کس پیالے میں بھر دیا۔ کس کس کو اسکی تلخیوں میں ڈبو دیا ــــــ میں نہیں وہ جانتے ہیں وہ... پیالے جن کے ہاتھوں میں تھے ــــــ

نہیں... نہیں سب تیرا وہم ہے...

کچھ بھی نہیں ہوا... (ایک خیال اُگتا ہے) بدگمانی پھیلانا شیطان کا کام ہے۔

سارى كہانياں ايک سى نہيں ہوتى ہيں...

سارے لوگ ايک ہى شراب نہيں پيتے...

شرابيں جدا ہيں...

كہانياں اور كتابيں جدا ہيں..

اب ميں دوسرى قسم كى آوازيں سن رہا تھا۔ ٹھنڈى، ميٹھى اور حوصلہ بخش آوازيں...ميں چونک پڑتا ہوں۔

سوچتا ہوں۔ موسم بدل گيا ہے۔ سوئچ بورڈ كا نمبر تبديل كر ديا گيا ہے۔ ايک روشنى...ايک نور سا ميرے اندر باہر چمكنے لگتا ہے۔ اور خوشبوئيں، ميرى سانسوں كو سہلانا شروع كرتى ہيں ــــ اور روٹھے ہوئے پرندے پھر سے آكے آنكھ مچولى كھيلنے لگتے ہيں...ايک پل كے لئے ميں خود كو بے حد ہلكا اور خوش محسوس كرتا ہوں۔
ليكن ميں جانتا ہوں

اجنبى ہاتھ اس نمبر كو بھى بدل دينگے

پھر دوسرے نمبر كى نئى راگ ہوگى

پھر تيسرے نمبر كى

چوتھے نمبر كى... پانچويں نمبر كى... چھٹے اور ساتويں نمبر كى...آٹھويں نمبر كى...نواں نمبر آخرى ہوگا...پھر كہانى دوبارہ ايک سے شروع ہو جائے گى

اجنبى ہاتھوں نے شايد ايک ہى كے نمبر كو چھُوا ہے...كوئى كہتا ہے...كوئى سناتا ہے كہانياں مجھے......

'جب کچھ بھی نہیں تھا۔تب بھی میں تھا...اور یہ سب کچھ جو تیرے سامنے پھیلا ہوا ہے...سارا منظرنامہ میرا ہے...'

یہ سُن کے میری سانسیں اندر ہی اندر مہکنے، مچلنے لگتی ہیں ـــــ پھر میں بے تاب سا ہو جاتا ہوں اور یکا یک سارے منظروں کو...سارے رنگوں کو اور ساری سیاہیوں کو ایک ساتھ پی لیتا ہوں...اور پریم آنکھ سے ساری مورتیوں کو چومتا ہوں پوجتا ہوں ـــــ اور پھر بے خود سا ہو جاتا ہوں

ہوش آتا ہے تو کیا دیکھتا ہوں...

دو لمبے سیاہ ہاتھ تمام سفید مورتیوں میں سے (جو اُس کی تخلیقات ہیں) باہر نکل آتے ہیں اور پھر مجھ پر سنگ باری شروع کر دیتے ہیں

میں لہولہان ہوتا ہوں

چیختا...چلاّتا...چکراتا ہوا گر جاتا ہوں

اور پھر پتھر کے روپ میں ڈھل جاتا ہوں

کوئی میرے قریب مجھ سے کہتا ہے...یہ نمبر بھی تبدیل ہوگا..اور پھر ایسا ہی ہوتا ہے...نمبر تبدیل ہوتا ہے!

☆☆☆

آخری کتاب

(۱۹۸۵ء کے نام)

کتابوں کے اُس شہر میں میری آمد پہ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ اور پھر ہوتا بھی کیوں ــــ؟

میری آمد غیر متوقع نہیں تھی۔ مجھ سے پہلے بھی لاکھوں کروڑوں لوگ اُس شہر میں آچکے تھے... اور پھر سفر کی دھڑکنوں کا ساتھ دے کر، اپنی اپنی کتاب کندھوں پر لئے اچانک گُم ہو چکے تھے ــــ نہ معلوم کہاں.... گئے تھے وہ سب...

وقت کے کس صحرا میں...

یا پھر کون سی روشن گلی میں....

کچھ نہیں معلوم...

میں جس مکان میں رہنے لگا۔ وہاں کے لوگ بھی ایک کتاب رکھتے تھے۔ جس کو وہ چاو سے پڑھتے بھی تھے۔ لیکن میں......اپنی طبعیت کی سُستی کے سبب....اُس کو اچھی طرح سے پڑھ نہ پایا...اس سے کچھ انجان اور بے خبر سا رہا۔

حتا کہ عمر کا بیسواں پتھر میرے ماتھے پر لگا

پھر اکیسواں...

پھر بائیسواں....

پھر تئیسواں..... چوبیس ویں پتھر پر میرے ساتھ ایک حادثہ ہوا۔ ایک حسین حادثہ...ایک پریم حادثہ...

پریم نے میرے سامنے کچھ حقیقتیں کھول دیں۔ میں جسے دشمن سمجھ رہا تھا۔ وہی میرا دوست نکلا...

اور جسکی دوستی پر مجھے ناز تھا۔ اُسی کے دل میں ایک تیز دھاری تلوار چھپی دیکھی...

یہ...یہ کیا....یہ اپنا کون....یہ پرایا کہاں کا ____

اپنی حیرانگی میں ____ میں بے انتہا رویا

چہروں کو دیکھ کر رویا

چاند کو دیکھ کر رویا

اور یار کو دیکھ کر رویا ____ سب مجھے معصوم، انجان اور مہربان سے لگے...ایک حسین کتاب کے سلسلے لگے.....

میرے آنسوؤں پہ وقت شاید مہربان ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنی کتاب میرے سامنے کھول کے رکھ دی...حروف میرے سامنے مسکرانے لگے۔ معنی کے گیت گُنگنانے لگے۔

میں ڈوبتا گیا....

گہرائیوں میں ـــــــ کتاب کی کہانیوں میں کھوسا گیا اور تلاش ذات میں بہت دور تک چلا گیا۔ واپس لوٹا تو شہر وہی تھا۔ شہر کے لوگ، شہر کے رنگ وہی تھے...لیکن آج.... کتنے جُدا سے لگ رہے تھے۔ شہر کی کہانیاں بھی آج بدلی بدلی سی لگیں ـــــــ معصوم اور کچھ رنگین سی....

لوگ ملے ـــــــ بچھڑے

بچھڑے اور پھر ملے.... باتوں باتوں میں بات صدیوں کی چلی۔ بات کتابوں کی ہوئی...ایک صاحب نے پوچھا

"تم کون سی کتاب کے ہو۔؟"

میں چُپ رہا

اُس نے اپنا سوال پھر دُہرایا

میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

"تمہاری ہی کتاب کا..."

وہ صاحب مطمئین اور خوش ہوا۔ پھر اُس نے دوسری باتیں چھیڑ دیں ـــــ ایک اور موڑ پر دوسری کتاب کا شخص ملا۔ اُس نے اپنے ہی رنگ میں پوچھا

"یار ایک بات پوچھوں..."

"ہاں پوچھو..."

''تمہاری کتاب کون سی ہے؟''

''وہی جو تمہاری ہے'' میں نے مسکرا کر جواب دیا

ایک لہر مسرتوں کی اُسکے چہرے پر نظر آئی۔ پھر وہ بھی چل دیا

وقت کے ایک اور موڑ پہ ایک اور شخص ملا۔ اجنبی تھا۔ لیکن دنوں میں اپنا سا لگا۔ اپنی ہی طرح سوچتا ہوا لگا لیکن ایک روز اُس نے میرا یہ بھرم توڑ دیا۔ اُس نے بھی سوال کیا

وہی سوال...

وہی صدیوں پرانا سوال...

''تمہاری کتاب ــــــ کون سی ہے؟''

''میری کتاب.....وہی جو تمہاری ہے...'' میں نے جواب دیا اور سوچنے لگا، کتنی کتابیں ہیں اس زمیں پر

پہلی کتاب....

پھر دوسری.....

پھر تیسری.....

پھر چوتھی......اور کتابوں کے نام پر کتنی خون ریز جنگیں ہوئی ہیں اور حاصل....نفرت....دوریاں...اور کھائیاں.... پہلے بھی وہ جنگل میں قبیلوں میں بٹ چکا تھا آج بھی وہ شہروں، قصبوں میں ٹولیوں میں تقسیم ہے۔

○

دن گذرتے گئے...

...اسی شہر میں...اسی ماحول میں..لیکن ایک روز اچانک میرے نتھنوں میں

شہر کی کالی ہوا گھس گئی...میں کچھ دیر کے لئے چکرا سا گیا...اور حیران رہ گیا

شہر کے لوگ تو میرے اپنے تھے

میری اپنی کتاب کے تھے...

پھر یہ عداوت...یہ دشمنی کس کے خلاف...؟

میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہاں صرف اتنا دیکھ سکا...کئی مہربان لوگ اپنے اپنے چاقو تیز کر رہے تھے...اور کئی یار دوست جیب سے خوشنما رومالیں نکال کر رسیاں بنا رہے تھے، موٹی اور مضبوط رسیاں...

گرمیوں کا موسم تھا۔ ایک دھوپ بھرے دن کی بات ہے۔ شہر کی بڑی سڑک پر مجھے ایک بھیڑ سی نظر آئی۔ پھر پتہ نہیں کس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ سب چلاّتے اور دوڑتے ہوئے میرے قریب آ گئے........اُنکی آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور خونخواریت ٹپک رہی تھی۔ ایک نوجوان جو اس بھیڑ کے آگے تھا، خود کو نمایاں کر کے مجھ پر حملہ کرنے ہی والا تھا کہ میں نے چیخ کر پوچھا

"میرا قصور کیا ہے؟"

سارا ہجوم ایک ہی زبان میں کہہ اُٹھا

"تم جھوٹے ہو...!"

ایک شخص ہاتھ میں چاقو لہراتے ہوئے بولا

”تم نے تو کہا تھا ـــــ تم میری ہی کتاب کے ہو“

”ہاں میں نے کہا تھا ـــــ میں آج بھی کہتا ہوں۔ تمہاری کتاب میری اپنی ہے۔.“ میں نے جواب دیا

ایک واقف کار جو کئی رومالوں کو جوڑ کے ایک مضبوط رسی بنا چکا تھا... اِس کا ایک سِرا میری طرف پھینکتے ہوئے چیخا

”تم نے تو مجھ سے بھی یہی کہا تھا.. میں تمہاری کتاب کا ہوں ـــــ حالانکہ میری کتاب دوسری ہے۔“

”جانتا ہوں ـــــ اور آج بھی کہتا ہوں۔ تمہاری کتاب بھی میری اپنی کتاب ہے“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.... یہ ناممکن ہے...“ تیسری کتاب کا فرد آپے سے باہر ہو گیا۔ اُس کا ایک ساتھی مجھ پہ پٹرول چھڑکتے ہوئے بولا ـــــ ”یہ دھوکے باز ہے۔ ہم سے بھی اس نے یہی کہا تھا ـــــ تمہاری کتاب میری اپنی کتاب ہے یہ جھوٹا ہے۔ اسے ہلاک کر دو ـــــ اسے مار ڈالو.... مارو....“

ایک چھوٹا سا خوش شکل لڑکا اپنے باپ کا اشارہ پاتے ہی جیب سے ماچس کی ڈبیہ نکالنے لگا۔ پھر جونہی ایک تیلی واقف کار شخص کے ہاتھوں میں دکھائی دی ـــــ مجھے اپنی موت صاف ننگی ناچتی نظر آ گئی...... میں گھبرا سا اُٹھا ـــــ لیکن صرف ایک لمحہ کے لئے... دوسرے ہی لمحے میرے منہ سے اچانک ایک قہقہہ نکل گیا۔ میں سوچنے لگا.....

جدا کہانیاں... جدا لوگ... جدا رنگ

لیکن اس پل کتنے ایک سے

وحشتوں کا رقص کتنا یکساں

ایک انسان کا قتل کتنا عظیم کارنامہ... لیکن یہ سب کچھ کیوں... کس لئے... کتاب کے لئے... کون سی کتاب کے لئے... یہ کیسی کتاب ہے... مجھے بھی سمجھاؤ...؟

''تم ہنس رہے ہو...' ہجوم میں سے کوئی بولا اور میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا...

''ہاں میں ہنس رہا ہوں ــــــ'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اور پھر میں اور زور سے ہنسنے لگا۔

''مگر کیوں ــــــ کیوں ہنس رہے ہو ــــــ کیوں قہقہے لگا رہے ہو...''

واقف کار نے مجھے گھور کر پوچھا

میں نے بھی انہی نظروں سے اُسے گھورا... موت میرے چاروں طرف عریاں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اب وہ کسی بھی لمحہ مجھ پہ ٹوٹنے والے تھے لیکن ایک عجیب بات یہ ہوئی۔ کہ میں نے اپنے اندر ایک نامعلوم قسم کی بے خوفی محسوس کی۔ میں نے نہایت ہی شانت لہجے میں کہا ــــــ

''سوچ رہا ہوں... ایک کتاب کے ٹکڑے کس نے کر دئے

....دوشی کون ہے ــــــ ہم... زمین والے یا پھر وہ.....آسمان....''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو۔''

ایک خونخوار آواز میرے کانوں میں اُتری

میں نے کہا

''صرف اتنا میرے دوست ــــــ ہماری کتاب آدم کی ہے۔ انسان کی ہے... اور انسان ایک ہے ۔ جیسے ہمارے سر کے اوپر چمکتا، بھاگتا ہوا وہ سورج ــــــ بتاؤ کس ایک کا وہ نہیں ہے۔ بتاؤ کس ایک کا وہ نہیں ہے....؟''

میں کچھ دیر چیختا... چلّاتا رہا

کچھ نظریں آسمان کی طرف اُٹھیں پھر یک بیک جھک گئیں

کوئی کچھ نہ بولا..... ایک ایک کر کے چل دئے!

☆☆☆

کوّا

یگوں کو بیتنا تھا... بیت گئے ـــــ میری روح کی طرح اُداس اُداس۔

میں جب کبھی اپنی گذری ہوئی زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کا حساب کرتا ہوں تو مجھے اپنے اندر دور کہیں کسی کوّے کی کائیں سنائی دیتی ہے ـــــ پہلے پہل میں نے سوچا... میرا وہم ہے۔ بھلا مجھ میں ایک آدمی میں کوّے کی کائیں کیا معنی... لیکن پھر دھیرے دھیرے مجھے یقین ہو چلا کہ کہیں نہ کہیں پر کوئی کوّا مجھ میں موجود ہے ضرور ـــــ کسی کہانی کی صورت میں یا پھر اور کسی روپ میں!

ایک دھندسی ہے کئی روز سے میرے اندر باہر چھائی ہوئی... اِس دھند میں سے ایک چہرہ قریب چھ سات سال پہلے دیکھا ہوا ایک عام سا چہرہ.... ایک لڑکی کا چہرہ بار بار اُبھرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن پھر دھند اُسے کھا جاتی ہے... چہرہ ڈوب جاتا ہے اور پھر کچھ ہی وقفہ بعد یہی چہرہ پھر اُبھرنے کی سعی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے

میں بھی کچھ پریشان سا ہوں

چاہتا ہوں کہ اس چہرے کو کچھ دیر کے لئے ہاتھوں میں لوں.... اسے اپنے سامنے ایک مورتی کی طرح رکھوں ـــــ اور پھر اسے دیکھتا رہوں ـــــ اور ایک

کہانی ترتیب دوں کہ میں نے کبھی وعدہ کیا تھا اُس سے (....)

''یہ ژھومو ہے''

سامنے میرے ہسپتال میں میرے ساتھ کام کرنے والا لداخی ملازم کہہ رہا ہے

''سالی بڑی گھمنڈی ہے''

''نہیں۔!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلتا ہے ''گھمنڈی نہیں ہے... یہ اس کا اپنا ایک انداز ہے''

''تم۔۔!'' ساتھی ملازم رفتن مجھے گھور کے دیکھتا ہے ''تم کیسے کہہ سکتے ہو''

''میں.....!'' کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہوں۔ واقعی میں خود بھی نہیں جانتا۔ یہ بات میں نے کیسے کہہ دی ۔ میں تو ابھی اس لڑکی سے ملا بھی نہیں ہوں... کوئی بات بھی نہیں کی ہے... صرف چندروز قبل ہی تو ہسپتال کے ٹھیک سامنے کے پرائمری سکول میں بحیثیت اُستانی آئی تھی... خاموش طبع لڑکی تھی، جوان تھی اور جانے کیوں مجھے اچھی لگی تھی...

اُن دنوں میری پوسٹنگ لداخ کے خلصی بلاک کے ایک خوبصورت گاؤں تگما چک (TAGMACHICK) میں ہوئی تھی۔ چھوٹا سا گاؤں تھا... آبادی کم تھی.. زیادہ تر لوگ دیسی علاج کو ہی انگریزی علاج پر ترجیح دیتے تھے ـــــ اسلئے ہسپتال میں کرنے کو مجھے کچھ خاص کام نہ ہوتا تھا۔ میں اپنی بے کاری اور بوریت سے بچنے کے لئے اپنا زیادہ تر وقت اسی سکول میں بچوں اور دوسری

اُستانیوں کے ساتھ گپ شپ میں گذار دیتا....

کچھ عرصہ کے بعد ایک روز...ژھومو، میرے قریب بیٹھی بڑی لگاوٹ سے کہہ رہی ہے

''بابو....آپ لکھیں گے نا مجھ پر ایک کہانی...''

''کہانی....'' سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر میں نے ایک خاص انداز اپنا کر کہا

''ہاں ضرور....میں تم پر ایک کہانی ضرور لکھوں گا''

''آپ اس میں کیا لکھیں گے''

اُسنے بڑے بھولپن سے پوچھا

میں کچھ دیر اُسے دیکھتا رہا

''وہی جو تم ہو....جو تمہارا ظاہر بتاتا ہے..جو تمہاری اصلیت ہے...'' وہ یکا یک مسکرائی ''آپ میری اصلیت جانتے ہیں'' میں سٹپٹا سا گیا۔ میں نے جلدی سے کہا

''جاننے کی کوشش کر رہا ہوں....''

میں اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جھانک کر دیکھتا۔ جانے کتنے خواب مسکراتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جانے کس انجان کہانی کے لفظ تخلیق ہو رہے تھے

ہوا یوں تھا....کہ کچھ روز پہلے ایک خوبصورت سی شام کو....میں ایک بڑے سے سیاہ پتھر کے سائے میں بیٹھا...اپنی تنہائیوں میں ڈوبا کچھ لکھنے میں محو تھا...کہ

اچانک وہ سامنے سے آتی ہوئی دکھائی دی... میں نے قلم روک کر اُسے دیکھنا شروع کیا۔

اُس کی چال میں محتاط پن تھا... حالانکہ وہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ بڑی اسمارٹ ہے... آزاد ہے..

قریب پہنچ کر اُس نے بڑی لگاوٹ کے ساتھ پوچھا

''بابو... آپ کیا لکھتے رہتے ہیں...''

''کہ ..... کچھ نہیں ژھومو''

''پھر بھی....'' اُس کے لہجے میں اشتیاق تھا

مجھے کہنا پڑا

''ایک کہانی لکھنے کی سعی کر رہا تھا. لکھ نہیں پا رہا ہوں...''

''اچھا —— '' وہ یکایک خوش سی نظر آنے لگی ''آپ ناولسٹ ہیں...''

''جی نہیں... ایک چھوٹا سا کہانی کار ہوں....!''

وہ کچھ سوچنے لگی تھی

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اُس نے اچانک کہا...

''تو پھر بابو.... آپ مجھ پر بھی ایک کہانی لکھئے....''

''تم پر.....'' میں چونک سا پڑا... ایک نیا سگریٹ سلگا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسی پل ایک مقامی عورت نے اُسے دور سے آواز دی...

''ہالے ژھومو....''

ژھومو مسکرائی۔ اپنے کندھوں کو سمیٹا۔ آواز کی جانب مڑی اور چل دی...

میں اپنی کہانی سے ہٹ کر سوچنے لگا...

ایک خواب سا روشن کرنوں کا دن تھا

اچھی پیاری دھوپ تھی.. میں ندی کنارے چھوٹے چھوٹے گول پتھروں پر بیٹھا پانی سے کھیل رہا تھا۔ پانی سے باتیں کر رہا تھا۔ سکول کی ایک بچی میرے پاس آتی ہے.. کچھ ہانپتی ہوئی سی...... کہتی ہے

''میڈم کپڑے مانگتی ہے''

''کس کے کپڑے۔؟''

''آپ کے کپڑے...''

''میرے کپڑے —— مگر کیوں۔۔۔؟''

''نقشہ کھینچنا ہے۔۔۔''

''نقشہ۔۔۔'' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔۔ پھر جب نقشہ کی حقیقت جاننے کے لئے میں سکول پہونچ گیا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ میڈم ژھومو کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا کیمرہ دیکھتا ہوں.. اور اُس کے ہونٹوں پر وہی کھینچی سی مسکراہٹ!

پھر کس نے کپڑے دئے۔ کس نے پہنے، مجھے کچھ یاد نہیں.. ایک خوابناک سا دن تھا، پیاری سی دھوپ کھلی ہوئی تھی —— سکول کی بچیاں دھلی وردی میں چمک رہی تھیں، چہک رہی تھیں —— اور ژھومو دھڑا دھڑ تصویریں لے رہی تھیں... کچھ تصویریں اُس نے مجھے بعد میں تھما بھی دیں (جو کہ گردِ رہ میں کسی

گلیارے میں کھو گئیں) مگر کچھ تصویریں جو اُسکے کیمرہ میں محفوظ تھیں

جانے کیوں مجھے آج یاد آرہی ہیں

کہانی کہہ رہا ہوں میں ــــــ کوّے کی۔ تگما چک کی۔۔ژھومو کی

سہ پہر کو ہی اُس روز شام کا گماں ہو رہا تھا۔ آسمان کو کالے ابر نے ڈھک

لیا تھا۔ قدرے سرد سا دن تھا۔ سویرے بارش پڑی تھی۔ بچوں کو چھٹی دی گئی تھی

ژھومو ہسپتال آ گئی... میں ورانڈے پر اکیلا کرسی پہ بیٹھا ہوا تھا

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی ــــــ

کچھ دیر خاموش رہی... دفعتاً بولی

''رفتن کہاں ہے۔؟''

''گھر گیا ہے۔۔زانسکار'' میں نے جواب دیا

''مجھے معلوم ہے'' اُس نے سر ہلا کر کہا۔ ''پکا فراڈ ہے وہ''

میں چُپ رہتا ہوں

کچھ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد کہتی ہے

''آؤ کھیلیں ــــ''

''چلو ــــ جیسی تمہاری مرضی...''

وہ ہینڈ بیگ سے تاش نکالتی ہے۔ پتے پھینٹتی ہے۔ ہم سیپ کھیلتے ہیں...

پھر خاموشی چھا جاتی ہے

اچانک میرے منہ سے نکلتا ہے...

''ژھومو ـــــ کیا سوچ رہی ہو، کچھ تو بولو...''

وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکرائی

''بابو ـــــ میں کیا بولوں۔ میں تو... آپ.....'' وہ کچھ کہتے کہتے اچانک رک جاتی ہے۔ اُس کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل جاتی ہے۔

یک بیک مجھے اُس کا سارا جسم تھرکتا ہوا نظر آ گیا.... اور اُسی پل میں تھرا اُٹھا۔ قریب ہی کہیں کسی کوّے کی کائیں سنائی دی

کائیں کائیں.... پھر ایک شور سا اُٹھا۔ میں اس شور سے اُلجھتا ہوں۔ کانپتا ہوں اندر ہی اندر... میرے ہونٹ اچانک حرکت میں آتے ہیں

''ژھومو... تم تو کہہ رہی تھی ـــــ آج ہماری بڑی پوجا ہے''

''ہاں... میں تو بھول ہی گئی تھی۔ ٹھیک یاد دلایا... اچھا میں جاؤں... بڑے گھمپا میں آج میلہ ہے... آؤ تم بھی''

وہ اُٹھ کے چلی جاتی ہے

کوّے کے شور میں کچھ کمی سی آجاتی ہے... میں حیران سا ہوں.. یہ کوّا... کون ہے آخر یہ کوّا ـــــ؟

یہ کائیں کائیں کیوں میرا پیچھا نہیں چھوڑتی... تب بھی ایسا ہی تھا۔ اب بھی ایسا ہی ہے.... سامنے میرے کوّا خاموشی سے مجھے ٹک ٹک گھورے جارہا ہے۔!

☆☆☆

لاش
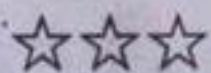
برفیلی رات کی یخ بستہ پُراسرار خاموشی میں اچانک بڑے زور کا زناٹا ہوا ــــ باہر کوئی کھمبا گرا تھا یا اندر کوئی شئے ٹوٹی تھی... یا کوئی متحرک جذبہ ساکت ہوگیا تھا۔ میں کچھ سمجھ نہ سکا۔ میں نے گھبرا کر آوازیں دیں... سر سے پیر تک اُسے جھنجھوڑا۔ بلند سُر میں نام لے کر اُسے پکارا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ کوئی حرکت نہ ہوئی...

تو... تو کیا تم بھی مر گئے..... دوست تم بھی....!!

یوں تو آدمی اپنے آپ کا بھی دوست نہیں ہوتا ہے لیکن چند ایسے رفیق مہربان دکھ سکھ میں شریک راز دار ساتھی ہوتے ہیں کہ اُنکی جدائی ایک عظیم سانحہ بن جاتی ہے۔ اُنکی بے وقت موت آدمی کو پاگل بنا دیتی ہے۔ اور پھر جب مرنے والا نظروں کے سامنے مرا ہو... بے رحم موت مرا ہو۔ تڑپ تڑپ کر مر گیا ہو تو پھر آدمی کیونکر اپنے آپ کو سنبھال سکے۔ کس طرح آنسوؤں کے زہر کو آنکھوں سے

باہر نکلنے سے روک سکے

میں بھی رویا —— چیخا..... چلاّیا...

لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ انہیں اس بات کی پروانہ تھی... کہ مرا کون ہے مرنے والا کب اور کن حالات میں دم توڑ بیٹھا ہے۔ ان باتوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا —— وہ مجھے روتا ہوا دیکھ کر بناسپتی رسموں کی کھوکھلی روایتوں کو زندہ رکھنے کے لئے رونے کی کوشش میں لگ گئے۔ اور پھر روتے ہوئے نظر آ گئے۔

جیسے لاش کے ہمدرد، حقیقی وارث وہی ہوں۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ سچ مچ کے آنسو ہیں یا انگلی سے مَلا ہوا تھوک...

سڑی ہوئی لاش کی سڑانڈ سے فضا میں بدبو پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ چند ہی لمحے بعد لوگ اپنی چیخیں، اپنی غمگینی بھول کر ناک اور منہ پر ہاتھ رکھیں گے۔ اور وہ اذیت ناک لمحہ.... اُس لمحہ کے کوفت آمیز احساس سے بچنے کے لئے میں خود ہی لاش کی تجہیز و تکفین کرنے لگا۔

میں جانتا تھا۔ میرے دوست نے زندگی کا ایک دن بھی خوشی و سکون سے نہیں گذارا۔ دنیا کی نظروں سے چُھپتا ہوا حیات آفرین لمحوں کی تلاش میں جنگل و بیابان میں بھٹکتا رہا لیکن جیسے بھٹکنا ہی اُس کی منزل تھی۔ تڑپنا ہی اُس کا مقدر تھا لیکن اب وہ تڑپ، وہ جدوجہد ختم ہو چکی تھی۔ اب یہ مٹی کا بے حس پُتلا تھا۔ مٹی کے نیچے سو کر ہی اسے ابدی سکون ملے گا۔ اس لئے میں جلد سے جلد یہ نیک کام انجام دینے میں لگ گیا۔ بلآخر میں اپنے مرحوم دوست کی لاش اپنے کندھوں پر اُٹھا

کرایک قبرستان میں پہونچ گیا۔اب میں اُسے قبر کے اندھیروں میں اُتارنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اچانک کچھ دوست، کچھ عزیز، کچھ اپنے برائے میرے کام میں رکاوٹ ڈالے کھڑے ہوگئے۔ وہ مُردے کو دفنانے سے پہلے اُس کا چہرہ دیکھنا چاہتے تھے، لیکن میں نے صاف انکار کر دیا......

جیتے جی جس کی عظمتوں کی قدر نہ کی گئی ہو۔جس کی معصوم چاہتوں کا مذاق اُڑایا گیا ہو۔مرنے کے بعد اُس کے مردہ جسم کو دیکھنے کا کیا معنی....؟ مرنے کے بعد اُس کے لئے یہ بے قراری کیوں ــــ؟

کوئی کچھ نہ بولا

وہ سب کچھ سوچنے لگ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب مل کے لاش کی جانب بڑھنے لگے۔ میں لاش کے قریب کھڑا اپنے انکار پر ڈٹا رہا لیکن کب تک...

زور زبردستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُنہوں نے بڑی بیدردی سے لاش کا کفن پھاڑ ڈالا۔ پھر جونہی اُنکی نظریں لاش کے چہرے پر پڑ گئیں تو اُنکے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔اُنہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔دوسرے ہی لمحے چیختے چلاتے ہوئے وحشت زدہ انداز میں بھاگ گئے۔

میں مسکرا پڑا۔لاش کے قریب کھڑا اُنہیں دیکھتا رہا پھر یکا یک ہی لاش حرکت میں آکر میرے سینے سے لگ گئی..!

☆☆☆

سچ کیا ہے؟

(پیر دستگیرؒ سے جب پوچھا گیا آپ کی عظمتوں کا راز کیا ہے
انہوں نے جواب دیا...راست بازی)

کئی دِنوں کی مسلسل بارشوں کے بعد آج موسم خوشگوار ہوا تھا۔ پیاری سی دھوپ نکل آئی تھی۔ آس پاس کھڑے پہاڑوں پر جمی سفید برف چاندی کی مانند چمک رہی تھی... سارا منظر دُھلا دُھلا سا لگ رہا تھا.. وہ اس وقت (No man's land) پر چل رہا تھا۔ برسوں پہلے بچھڑے ہوئے سرحد پار کے اپنے کچھ رشتہ داروں سے مل کے آیا تھا۔ اس لئے بڑا خوش نظر آرہا تھا۔ اچھے موڈ میں دھیمی رفتار سے چلتا ہوا وہ اب.... اِس طرف کے بارڈر پر چیکنگ آفیسر کے نزدیک پہنچ گیا اور ادب سے کھڑا اپنے کاغذات وشناختی کارڈ دکھانے لگا...

چیکنگ آفیسر درمیانی عمر کا بنگالی تھا۔ شناختی کارڈ وسامان کا معاینہ کرنے کے بعد اُس نے بڑی اپنائیت کے ساتھ کہا

"ہاں تو مسٹر اشفاق۔۔۔ کیسا رہا سفر پاکستان کا..."

"جناب...میں پاکستان نہیں گیا تھا۔ میں گیا تھا آزاد کشمیر......

I mean to say Pak occupied Kashmir "

آفیسر خاموشی سے اُسے دیکھتا رہا

''اب رہا سوال سفر کیسا رہا۔ تو جواب میں عرض ہے۔ بہت شاندار رہا۔ بہت مزہ آیا...''

''Really ....'' آفیسر نے حیرت سی ظاہر کی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو...؟''

''جناب... میں سچ کہہ رہا ہوں ——''

''سچ کیا ہے... میں سُننا چاہتا ہوں...'' بنگالی آفیسر نے اشتیاق ظاہر کیا

اشفاق بولا ''سچ جناب یہی ہے... میں چکوٹی گیا تھا... مظفر آباد گیا تھا۔ راولا کوٹ گیا تھا —— میں وہاں جہاں پر بھی گیا۔ میری کوئی چیکنگ نہیں ہوئی۔ مجھے کسی نے بھی مشتبہ نظروں سے نہیں دیکھا.... بالکل اپنائیت سی میں وہاں محسوس کرر ہا تھا... اور یہاں... یہاں جناب....''

''بنگالی آفیسر نے بات کاٹ کر کہا ''یہاں کیا ہے....؟''

''یہاں جناب عذاب ہی عذاب ہے۔ قدم قدم پہ فوج کی چکینگ ہے۔ اِدھر آپ چھوڑ دینگے، اُدھر سامنے بی ایس ایف والوں کی چیکنگ ہے۔ پھر چک پوسٹ پر ایک اور چیکنگ.... پھر آگے اور مصیبت.... یہ بار بار کی چیکنگ جناب...''

''بس ایک لفظ بھی نہ کہنا....'' آفیسر نے حکم دے کر کہا۔ ''تم جاؤ''

اشفاق خاموشی سے اپنا سامان اُٹھا کر آگے چل دیا۔ آفیسر کی آنکھیں لمحہ بھر کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔

☆☆☆

نِروان

(تاریکیوں کا دور تک لمبا جال اور لہو میں چمکتے ہوئے ستاروں کا جلوس)

تاریکیاں اپنے پر پھیلا رہی ہیں...

آنکھوں کے سامنے دھند میں کانپتی ہوئی پرچھائیوں کے سیہ زرد ملگجے رنگ پھیل رہے ہیں ۔ اور رنگ.... رنگ میں تحلیل ہو رہے ہیں... سفید تاریکیوں میں اشنان کر رہا ہے۔ سبز زرد رنگ میں بدل رہا ہے اور سیہ اپنے بدن سے روز ایک اُجلا گولا باہر نکال دیتا ہے....

یہ چکر.... رات دن کا یہ سلسلہ.... یہ سب کیا ہے....؟

میں خود سے کہہ اُٹھتا ہوں

ذہن میں ایک جملہ گونجتا ہے...

(زمین سے بڑھ کر اس زمین پر کچھ بھی نہیں ہے)

ستیہ بدھ نے کہا تھا ——— اور کتنا سچ کہا تھا...

بدھا آئے ہیں... بدھا آتے رہینگے ...خوشبوئیں اپنے پنکھ ہر جگہ پھیلا دیتی

ہیں.....رات کا خاتمہ ضروری بھی ہے

پر یہ ہماری کہانی.....!

- = + x -

+ = - x -

+ = + x +

میری سلیٹ پر جو آڑی ترچھی لکیریں ہیں ۔ وہ سب نشانیاں ہیں ۔ تصویریں ہیں ۔ ایک تصویر مہاتما بدھ کی ہے ـــــ فیصلہ کرنے کی کُرسی پر بیٹھا ہوا.......

اُس کے دائیں طرف سامنے ایک خوبصورت سا باغ ہے.....جس میں مختلف رنگوں کے حسین پھول ہیں...اور سر پر چمکتا بھاگتا ہوا سورج....

اور بائیں طرف ـــــ

ایک سیاہ مکروہ بھیانک.....بڑے بڑے باہر نکلے ہوئے دانتوں کا چہرہ...

ایک عجیب سا چہرا

(دو روپ جیون کے....)

میں سوچتا ہوں...

سلیٹ پر ایک لکیر جسم کا آکار لیتی ہے ۔ ہر جسم کا ایک چہرا ہوتا ہے ۔ دو ہونٹ حرکت کرتے ہیں...

'میں نے سدھو دَھن کے راج رنگ سب دیکھے اور سب رس پیے ...سب

عیش کیے...مگر نگرواسیوں کی پِتا سے انجان انجان جیا میں...

یونہی کئی بار...نیند میں جاگا...سوچا...چونکا سا...کون ہے یہ...؟

ایک بھکاری

کیوں ہے بھکاری....؟'

رینگتی بھاگتی ہوئی رات...اور سوچیں!۔

پھر اک روز اُس نے جب دیکھا...

اِک بوڑھا سہما

آنکھیں باہر...بھوک بیماری

کانپتے ہاتھ...کمزور ٹانگیں

گوتم چونکا....غور سے دیکھا اُسے... پوچھا ـــ ''کیا چاہئے تمہیں....؟''

''دان.....!''

''کس چیز کا....؟''

''مکتی اِس حال سے....''

''کس حال سے....؟''

بوڑھا کھانسا...درد سے کراہا...گوتم کو گھمبیر کیا ـــــ اپنے آپ میں گہری نیند سے جاگ اُٹھا وہ...

یہ سب کیوں ہے۔درد یہ کیا ہے...کس کا لیکھا...(کون ہے لکھتا، پڑھتا ہم کو) کیا ہے آخر یہ ہستی۔؟

اور پھر گہری طویل خاموشی کے بعد اُس کے لب سے بول یہ نکلے ـــــ

'راج مبارک تم کو ہو

میں تو ہوں یار و دھڑکن داس

کیا ہے حقیقت... کیا ہے مایا. کیا واہمہ ہے... کیا وشواس.....!!'

سوالوں کے سمندر کے ساتھ وہ ـــــ راج پاٹ چھوڑ کے محل سے باہر نکل آیا ـــــ بستیوں میں گھوما..... جنگلوں کی راہ لی... غاروں میں بیٹھ گیا۔ گیان دھیان کے پتھ پر دُور تک نکل گیا۔ اپنے آپ میں... پھیلے اَن گِنت نظاروں میں... صبحوں اور شاموں میں کچھ تلاشنے لگا... اندھیاروں کا اک لمبا سفر اور لہو میں جگنوؤں کا ایک جلوس......ایک زمانہ بیت گیا جب...

درخت کے نیچے گیا میں... گیان کا پھر وَردان ہوا۔ گوتم کو نِروان ملا

کوئل کوکی... کلیاں جھومیں..... لمحے مہکے... طوطے بولے......

حیران خواب سوالی سارے۔

کس کی آنکھ کے ہیں سب تارے۔ جگمگ جگمگ پیارے پیارے

بیچ سمندر... دیپ یہ من کا.. یگ سے یگ تک پھیلا ہے

سلیٹ پر اُس نے اپنی انگلیوں سے یہ عبارت لکھی

تمہارے اِس جنگل میں جو بھی اپنی پرچھائی کو فتح کرے گا... فاتح وہ کہلائے گا ـــــ اور یہ کام آدمی کا ہے !

☆☆☆

جنگل کے قیدی

(اپنی بیٹی سمینہ مشتاق کی نذر)

جنگل خوشبوؤں کا....

پھولوں کا... ہرے بھرے درختوں کا.. لاکھوں کروڑوں حشرات الارض کا.. چرند، پرند، درندوں کا... اور انسانوں کا... جنگل ـــــ !

وہ کئی دہائیوں سے اُس جنگل میں مقیم تھا۔ جنگل کی سرسبز حسین دنیا اُسے بہت بھلی لگ رہی تھی۔ جنگل کے موسم، پرندوں کی میٹھی سریلی آوازیں اور ندی نالوں کا دل لبھانے والا سوز و سرور اُسے جنون کی حد تک پسند تھا... وہ اپنی انہی میٹھی دھڑکنوں میں مسرور تھا کہ ایک روز اچانک اُسے محسوس ہوا... خوشبوئیں کوئی چُرا رہا ہے کہ خوشبوئیں دن بدن کم ہوئی جا رہی تھیں۔ کوئلیں اور رنگ برنگی پرندے جو پہلے پہروں پاس سامنے بیٹھ کے گاتے تھے، خوشیاں مناتے تھے۔ اب اپنے بول سنائے بغیر ہی سو جاتے ہیں اور خوبصورت ناگنیں جو بین کی دھن پر پہلے بے اختیار سامنے آ کے ناچتی تھیں اب نا معلوم خوف کی وجہ سے ہر وقت سہمی ہوئی سی نظر آتی ہیں... دور بھاگتی پھرتی ہیں......

یہ سب کچھ جنگل کی روایت میں نہ تھا، پہلے اُس نے کبھی دیکھا نہ تھا پھر یہ سب کیا ہورہا تھا۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہ پا رہا تھا۔ کافی سوچ وچار کے بعد ایک روز اُس نے برادری کے لوگوں میں اعلان کر دیا ——

"دوستو..... میرے بزرگو اور عزیزو... تمہیں بھی وہ سب دکھائی دے رہا ہے، جو میں دیکھ رہا ہوں...."

"کیا —— کیا دیکھتے ہو تم..."

ایک عمر رسیدہ بزرگ نے پوچھا

اُس نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا...

"موسم دن بدن بے دھڑکن ہو رہے ہیں۔ خوشبوئیں کوئی چور چرا رہا ہے ہوائیں زہریلی ہو گئی ہیں۔ اور سارے پھول، سارے پتے اپنا رنگ کھو چکے ہیں۔"

"تو ہم کیا کریں؟" بزرگ نے روکھی ہوئی آواز میں کہا "ہونی ہو کر رہتی ہے"

"ہمیں اس جنگل کو تباہی سے بچانا چاہئے"

"تو بچاؤ نا یار۔" ایک نوجوان بولا اور اُس کے دوسرے ساتھی نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "کس نے روکا ہے تمہیں" پھر وہ سب ایک ایک کر کے وہاں سے نکل گئے اور بچے اُنکے پیچھے تالیاں بجاتے ہوئے نظر آ گئے...

وہ دیر تک اکیلا حیران کھڑا کچھ سوچتا رہا... جنگل کے مکینوں کی بے حسی پر جلتا کڑھتا رہا۔ یک بیک وہ چونک سا پڑا۔ اور تاسف سے ہاتھ مَلنے لگا... اُسے

لگا...زہریلی ہوائیں اُس کی سانسوں میں دور تک گھس چکی ہیں...

وہ گھبرا سا اُٹھا...اُسے وحشت سی ہونے لگی....اس جنگل سے...جنگل کے مکینوں کی بے حسی سے اور جنگل میں گشت کرتی ہوئی زہریلی بدبودار ہواؤں سے...

دوسرے ہی لمحے اندر کے کسی نے کہا

''بھاگ جا.... یہاں سے بھاگ جا.... یہ جنگل اب تیرے کام کا نہیں رہا ....بھاگ جا....''

مذید کچھ سوچے بغیر وہ ایک طرف کو چل پڑا۔ راستے میں اجنبی، پرائے اپنے...کئی قسم کے لوگ ملے۔ لیکن اُس نے کسی کو اپنا ہم سفر نہ بنایا۔ راز دار نہ بنایا... نظریں بچاتا ہوا چُپ چاپ چلتا رہا...کئی ہفتوں کے مسلسل سفر کے بعد وہ جب اس راستے کے انت پر پہونچا...تو وہاں پر اُس نے بہت ہی اونچی اور موٹی دیوار کھڑی پائی...

دیوار کے محافظ نے اُسے دیکھ کر پوچھا...

''کہاں جانا چاہتے ہو....؟''

''دیوار کے اُس پار...''

''اُس پار..تم نہیں جا سکتے....''

''کیوں...نہیں جا سکتا...؟'' اُس نے محافظ کو گھور کر پوچھا...

محافظ نے سمجھا دیا

''یہی حکم ہے..یہی فرمان ہے...''

''کس کا فرمان ہے یہ...؟''

محافظ نے آسمان کی طرف شہادت کی انگلی اُٹھائی۔

کچھ دیر تک وہ آسمان کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک ایک خیال اُس کے ذہن میں کوندا... .

یہ راستہ تو بند ہے... مخالف سمت کا راستہ ضرور کُھلا ہوگا ــــ پھر وہ مخالف سمت میں چل پڑا

مغرب کی طرف چلتے ہوئے جب وہ جنگل کے آخری سرے پر پہنچا.. تو وہاں بھی اُس نے ایک موٹی اور اونچی دیوار کھڑی پائی اور کچھ محافظ بھی نظر آ گئے.... باتیں بھی ویسی ہی ہوئیں.. جو پہلی سرحد کے محافظ سے ہو چکی تھیں...

اُس نے ہمت نہیں ہاری.... جنگل سے رہائی پانے کے لئے اپنا سفر جاری رکھا... پھر جب شمالی سمت کے آخری سرے پر پہنچ گیا ــــ تو ازل سے کھڑی موٹی اور اونچی دیوار جیسے اُس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اُسکی بے بسی اور تھکن پر جیسے قہقہے لگا رہی تھی... جنوب کی سمت جانے کا خیال اُس نے ترک کر لیا۔ کیونکہ تیسری سرحد کے محافظ نے اُسے سمجھا دیا کہ......

''تم جس زمین پر رہتے ہو.. وہ زمین گول ہے...''

''تو پھر اس جنگل سے رہائی کیسے ممکن ہے....!''

''یہ میں نہیں جانتا ــــ ہاں اتنا جانتا ہوں۔ ایک دن تمہیں رہائی ضرور ملے گی....''

''مگر کب.....وہ دن کب آئے گا...؟''

وہ اپنی تمام قوت سے چیخا...

محافظ خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر بولا

''وہی جانتا ہے...صرف وہ...اوپر بیٹھا...آسمان والا...''

''تو...تو کیا...میں.....!'' الفاظ اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ محافظ کو اُس نے نظر بھر دیکھا۔ دیوار کو لمحہ بھر گھورا.....اور پھر تھکے ہارے قدموں کے ساتھ واپس جنگل کی طرف مُڑ گیا.....

جنگل ـــــ جہاں اُس نے بچپن میں پریوں کی پُر اسرار میٹھی لوریاں سنی تھیں جہاں اُس کے خواب جاگ اُٹھے تھے... جہاں اُسکی امنگیں جواں ہوئی تھیں.. یہ میرا حسین جنگل.....ہزاروں مخلوقات کا جنگل ،خوشبوؤں اور گیتوں کا جنگل...جواب بالکل بدل چکا تھا۔ سیاہ اور زہر آلودہ ہواؤں کی زد میں آچکا تھا۔ ہر طرف وحشتیں ناچ رہی تھیں... اور کئی اطراف میں آگ کی لپٹیں اُٹھ رہی تھیں ـــــ درخت جل رہے تھے... پتے جل رہے تھے... پھول جل رہے تھے.... پھل جل رہے تھے ـــــ چرند پرند، درندے اور انسان سب شعلوں کے نرغے میں تھے ـــــ سب چیخ رہے تھے، چلّا رہے تھے...درد سے کراہ رہے تھے لیکن آواز کسی کی سنائی نہیں دیتی تھی۔ وہ سب رو رہے تھے، ماتم کر رہے تھے لیکن آنسو کسی کے دکھائی نہیں دے رہے تھے..وہ سب موت سے ہم کلام تھے ـــــ لیکن موت کے فرشتے کو کوئی چھو نہیں پا رہا تھا...

ہر طرف عفریت تھی... ہولنا کی تھی

ایک دہشت ناک خاموشی طاری تھا... وہ اچانک چیخ سا پڑا

"اے خدا... اے میرے خدا... یہ قہر... یہ عذاب... یہ آگ یہ احساس بے بسی اور کم مائیگی کا اور کب تک... اور کتنی صدیوں تک....؟"

وہ.... چیختا، چلاّ تا رہا......

آسمان خاموش تھا ــــــ خاموش ہی رہا... دور کچھ پیڑ پودے جل کر گر رہے تھے ــــــ راکھ ہو رہے تھے... فضا میں جلے ہوئے گوشت کی بو تیزی سے پھیل رہی تھی... سانس لینا دشوار ہو رہا تھا... اُس کا دم بُری طرح گھٹنے لگا ــــــ

اور پھر وہ بے ہوشی کی گود میں جا چھپنے ہی والا تھا... کہ سامنے سے قد بلند روشن ماتھے کا ایک ذی عزت فرد کندھے پر پانی کی... مشک لئے... اپنی طرف بڑھتا ہوا نظر آ گیا ــــــ

قریب آ کر اُس نے شانوں سے پانی کی مشک اُتار کے رکھ دی ــــــ ماتھے کا پسینہ پونچھا ــــــ اور پھر اُداس کھڑے شخص سے گویا ہوا....

"میں اس جنگل کا راز دار ہوں... تم مجھے جنگل کا بیٹا بھی کہہ سکتے ہو... میں اس آگ کا مفہوم جانتا ہوں ــــــ اور یہ بھی جانتا ہوں یہ آگ کب سے ہے اور کیوں ہے"

"اے معتبر.. مجھے تمہاری ہی تلاش تھی"

"مجھے معلوم ہے..." قد بلند روشن ماتھے کا ذی عزت فرد مسکرا کر..... بڑی

اپنائیت سے بولا.......

اُداس شخص جلدی سے اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے لگا...لکیریں بھی کچھ ایسی ہی کہانی کہہ رہی تھیں ... کہ جس کی جسے تلاش ہوتی ہے...اُس کو وہ مل ہی جاتا ہے ــــ لیکن کہاں...وقت کے کس موڑ پر...؟ یہ وقت ہی جانتا ہے ــــ یا پھر وقت کو جاننے والے....! بلآخر اُس نے اپنی بات کہہ ہی ڈالی

''اے معتبر میں اِس جنگل سے بیزار ہو چکا ہوں کہیں دور بھاگ جانا چاہتا ہوں، کوشش بھی کی، لیکن راستوں کے انت پر دیواریں کھڑی ہیں اور محافظ بھی تیار...کوئی ترکیب بتاؤ کہ اس قید خانے سے، اس جنگل سے رہائی ملے....''

''ایک راستہ ہے لیکن وہ غیر قدرتی ہے...''

''میں سمجھا نہیں...''

''جنگل کے محافظ کی آنکھ بچا کر...تم دیوار کے اُس پار جا سکتے ہو لیکن پتے پتے پر لکھا ہے کہ یہ ایک جُرم ہے، جنگل کے مکین بھی اسے بُرا سمجھتے ہیں اور جنگل کا مالک بھی...''

''تو پھر ــــ'' اُس نے بے بسی کے ساتھ پوچھا ''میری رہائی کیسے ممکن ہے...؟''

''ایک دن اُس کا بھی مقرر ہے...لیکن سنو...ایک راز کی بات'' کچھ لمحے سوچنے کے بعد اُس نے کہا...''اصل میں تم یہ آگ بُجھانے کے لئے ہی اِس جنگل میں لائے گئے ہو...''

اداس شخص مسکرایا

''ایسا میں نے بھی سوچا تھا۔ اے معتبر بُزرگ... لیکن چار سُو لگی ہوئی آگ بُجھانا ناممکن ہے''

''کوشش زندگی ہے۔ یہی میرا عقیدہ ہے....'' معتبر ذی عزت فرد کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔ ''جنگل جس زمین پر آباد ہے۔ اُس نے مجھ سے کہی ہیں سفید سبز پرچم والوں کی کچھ عمدہ باتیں...... مشکلات پہ قابو پانا آدمی کی شان ہے۔ چلو نکلو'' اُس نے پانی کی مشک اپنے کندھوں پر رکھ دی اور آہستہ سے نکل پڑا

کچھ دیر بعد وہ بھی چل پڑا اپنی راہ

لیکن اُس کی چال میں زرا بھی تھکن نہ تھی

ایک اعتماد صاف جھلک رہا تھا۔ ایک اُجالا کرن کا اُس کے وجود کی گہرائیوں میں پھیل رہا تھا۔

☆☆☆

کہانی

(ضروری نہیں ہے کسی واقعے کو افسانہ بنانے کے لئے

آدمی جھوٹ گڈھ لے۔ سچی کہانیاں بھی خوبصورت ہوتی ہیں....!)

کہانی کے ساتھ میرا عجیب سا رشتہ ہے.... اِسکول کے دنوں میں جب میں تاریخ کی کتاب کھول کے پڑھتا تھا۔ بابر کے قصے... پھر ہمایوں اور شیر شاہ سوری کی لڑائیاں....اکبر...بیرم خان وغیرہ....

میرے سامنے کردار (بے چہرہ) مگر انجانے سے انداز میں دیکھے بالے چہرے اُبھرتے تھے...ایک کہانی سی بنتی تھی.....

'بہرام ڈاکو....' والد صاحب کی پرانی کتابوں کے صندوق میں زرد کاغذ پر لکھی ہوئی بڑے بڑے کالے حروف کی ایک ناول تھی وہ.....جو بچپن میں میں نے اچانک پڑھی ——— کہانی جاسوسی تھی۔ دلچسپ تھی اور کچھ ڈرا دینے والی بھی......کہیں پہ اس نے میرے اندر خوف کی ننھی سی لہر جگا دی تھی، تبھی تو میں آج تک اس ناول کے پہلے خدوخال نہیں بُھلا پایا ہوں....اور شاید بلکہ یقیناً میری لکھی

اولین کہانیوں میں سے ایک کہانی جاسوسی ہی تھی ـــــ جاربر کی لاش.... جس کو میں نے ایک ٹیلر ماسٹر دوست کو سنا کر محسوس کیا۔ کہ وہ کچھ دیر کے لئے سکتے میں آگیا۔ قدرے حیران اور پُر احترام نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے لمبی ہوتی ہوئی خاموشی توڑ دی بلکہ سوال کیا ـــــ جاربر کی لاش میں حرکت کیسے ہوئی...؟ وہ تہہ خانہ کس کا تھا ـــــ ؟

وہ ایک ہنس مکھ آدمی تھا۔ بھاری جسم کا مالک.... دُکان پر بڑی کاریگری سے قمیض کوٹ، پینٹ وغیرہ سِلا کرتا تھا... خود اُس دُکان کا مالک تھا۔

میں اُن دنوں بالکل بے کار سا تھا۔ کالج کے امتحانات ختم ہو چکے تھے۔ گھر سے کھانا کھا کر نکلتا۔ اور دن بھر دوستوں کے ساتھ کرکٹ کھیلتا.... شام کے کچھ گھنٹے اُس دکان پر گذار دیتا تھا... قریب دس گیارہ بجے رات کو جب ہر طرف خاموشی چھا جاتی.... میں اِصرار کرتا....

”وستا (اُستاد)۔ سناؤ اب وہ گانا...“

وہ تھوڑا سا گلا کھنکار کے کہتا...

”ہوں ـــــ تو اب آپ گانا سُننا چاہتے ہیں۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد وہ گانا شروع کرتا

سوجا راجکماری سوجا

سوجا میں بلی ہاری سوجا

سوجا راجکماری سو جا.... روپ نگر سے سکھیاں آئیں۔ راجاجی مالا

پہنائے.... مجھے ایسا لگتا... جیسے رات بھی ان بولوں کی مٹھاس میں ڈوب سی جاتی... بہت میٹھی اور سوز بھری آواز تھی اُس کی۔ میں اُس وقت موسیقی کی لہروں میں ڈوبا ہوا سا گھر چلا جاتا...

تقریباً روزانہ شام کے کچھ گھنٹے میں اُس کی دکان پر گزار دیتا تھا۔ اس دوران میں سلائی دینے کی تھوڑی سی سُدھ بُدھ بنا چکا تھا۔ کبھی کسی شلوار قمیض میں سلائی بھی کرتا اور اچھی سیدھی سلائی دیکھ کر اندر ہی اندر خوش بھی ہوا کرتا تھا.... یہ کام میں شوقیہ سیکھتا تھا۔ ساتھ ہی یہ پیشہ اختیار کیے ہوئے لوگوں کے لئے دل میں ایک ہمدردی بھی جنم لے رہی تھی...

اِس وقت میرے ذہن میں دو ٹیلر ماسٹر حضرات کی صورتیں گھوم رہی ہیں... ایک وہ جسے میں دُوستا کہتا تھا... (اصلی نام بھول چکا ہوں) اور دوسرا فاروق احمد کمہار عرف فاروق کرال... کمہار خاندان کے ساتھ تعلق رکھتا تھا... اُس کے گھر کے سارے افراد والد ماں بہن بھائی سبھی آبائی پیشے کے ساتھ وابستہ تھے۔ بلکہ آج بھی ہیں لیکن بیس اکیس سال کا صاف اُجلے خدوخال کا مالک فاروق کرال.... اپنے فن میں ماہر ایک اچھا ٹیلر تھا... اپنی دُکان چلاتا تھا. اُس کے رنگ ڈھنگ نرالے تھے بات کرنے کا انداز بھی بھلا سا تھا... ایک بار میں اُس کی دکان میں داخل ہو گیا اور سبز رنگ کا کپڑا اُس کے سامنے رکھ کر کہا

"مجھے خان ڈریس سلوانا ہے۔ اور ایک اچھا واسکٹ بھی..."

"واسکٹ... اس کپڑے کا....!"

اُسکے لہجے میں تھوڑی سی حیرانگی تھی... عام طور پر واسکٹ کے لئے ٹیری لین... ٹیری وول یا اسی قبیلے کا کوئی دوسرا قیمتی کپڑا استعمال ہوتا ہے۔ اور جو کپڑا میں نے اُسکے سامنے رکھا تھا۔ وہ معمولی سا کاٹن تھا۔

''ہاں... اسی کپڑے کا... لیکن واسکٹ بننا چاہئے۔ ایک دم سپیشل...''

وہ مسکرایا

اُسکی گول گول نیلی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ آہستہ سے بولا

''میں سمجھ گیا...''

اور پھر جو واسکٹ اُس نے بنا کر دیا۔ وہ واقعی عمدہ بنا تھا۔ کئی سالوں تک میں نے استعمال کیا۔ میرے کئی واقف کاروں نے کہا۔

''یہ ہسپتال کا اپرن ہے...''

''جی نہیں... غور سے دیکھئے... یہ واسکٹ ہے...''

یاد رہے میں کہانی کہہ رہا ہوں۔ اُن دو ٹیلر ماسٹروں کی —— جو اِس وقت منوں مٹی کے نیچے سوئے ہوئے ہیں۔ دُوستا اور فاروق احمد کمہار عرف فاروق کرال۔

دونوں میرے گھر سے قریب ڈیڑھ دو سو میٹر کے فاصلے پر مین بازار میں اپنی دُکان چلا رہے تھے۔ اور دونوں کی اچانک موت... میرے لئے کسی بڑے صدمے.... کسی تحیّر... کسی تعجب خیز واقعے سے کم نہ تھی۔ وہ لمحہ... اُس لمحے کی چبھن

میرے دل میں پوشیدہ ہے آج بھی ــــــ کوئی نامعلوم سی بات؟

گرمیوں کے دن آہستہ آہستہ سرک رہے تھے...

ووستا کی عمر قریب تیس بتیس سال تھی۔ قد میں وہ بالکل چھوٹا تھا۔ جسم گوشت سے بھرا ہوا بلکہ نزدیک سے دیکھنے میں وہ ٹھِگنا سا لگتا تھا۔ لیکن ٹیلرنگ میں وہ ایک دم ماہر تھا۔

اُسی سال کی بات ہے۔ سردیاں ابھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اکتوبر کے آخری دن تھے۔ زرد زرد سی چمکتی دھوپ دُکان کے سامنے پھیلی ہوئی تھی... وہ اچانک کہہ اُٹھا

''میں اب یہ دُکان بند کر رہا ہوں...''

''کیوں ــــ؟'' میں نے حیرانگی ظاہر کی

اُس نے دھیمے سُر میں جواب دیا

''صحت اچھی نہیں ہے....''

''کیا بات ہے... کیا ہوا ہے تمہیں...؟''

اُس نے روکھے سے انداز میں کہا...

''یہی... کف.... بخار اور کھانسی...''

''ارے بھئی علاج ہے... علاج کراؤ...''

میں نے تسلی دی...

اُس کے انداز میں وہی روکھا پن تھا

''اسی لئے تو دُکان بند کر رہا ہوں —— علاج کرنا ہے...''

ٹھیک دس دن بعد... محلے کے ایک واقف کار نے اطلاع دی۔

''دوستا چلا گیا...''

''چلا گیا... کہاں چلا گیا۔'' میں نے بے صبری سے پوچھا

''وہیں... جہاں سے کوئی واپس لوٹتا نہیں ہے... دُستا مر گیا''

''کیا ——'' مجھے ایسا لگا۔ جیسے کسی نے میرے سینے پر ہتھوڑا مار دیا ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میرے اندر تحیّر کی بجلیاں سی چمکنے لگیں... وہی بجلیاں... وہی لہریں... وہی احساس (وہی کوئی نا معلوم سی بات...!)

مَرا کون ہے...؟

کہانی کیا ہے...؟

میں کہانی سے کیوں بچھڑ سا گیا ہوں...؟

کہانی میں میری روح ہے

یہ میں ایک جسم ہوں

دُستا... عالمِ عدم میں چلا گیا۔ جیسے کہ باقی لوگ —— میرے والد صاحب... چاچا... دادا... نانی اور دوسرے فوت ہو کر چلے گئے۔ والد بزرگوار کی

اچانک موت پر بھی ایک تعجب ...ایک تحیّر کا سایا میرے سارے وجود کو جکڑے ہوئے رہا۔ کچھ تلخ حقیقتیں حیرت ناک انداز میں مجھ سے ٹکرائیں..... جنہیں سمجھنے میں مجھے کافی عرصہ لگا۔ یہ میری عقل کی خامی ہی ہوسکتی ہے۔ یا انسان کا جذباتی نظام ہی کچھ ایسا ہے...قریب چار پانچ سال تک میں اندر ہی اندر اپنے والد صاحب سے روٹھا سا رہا۔ اور روٹھنے کی وجہ یہی تھی کہ....'اگر آپ کو راہِ عدم کو نکلنا ہی تھا۔ تو کم از کم کوئی اشارہ کیا ہوتا...کوئی آخری بات کہی ہوتی...کوئی صلاح دی ہوتی...'

پھر ایک لمبے عرصے کے بعد میری سوچوں میں ایک خواب سا وجود پایا۔ والد صاحب قریب آ کر کہہ اُٹھے...

''بابا....میرے نادان بیٹے...مجھے کیا معلوم تھا—— کہ سو جاؤں گا۔ اور سویرے تم مجھے بیدار نہیں پاؤ گے۔ یہ سب اچانک ہو جائے گا—— وہی ہے ایک....اللہ پاک....جس کی مرضی چلتی ہے۔ وہی ہمیں جنم دیتا ہے۔ پیدا کرتا ہے۔ موت دیتا ہے....سب جہاں اُسی کے ہیں——''

واقعی——! بندہ اپنے حال سے بے خبر ہے۔ حالانکہ وہ چیختا ہے... یہی گمان لئے پھرتا ہے کہ میں ہوں زیادہ جاننے والا...میرے پاس معلومات کا بڑا خزانہ ہے —— سب نفس کا فریب ہے۔ کہانی پھر جنم لے رہی ہے کہ قصہ ابھی پورا نہیں ہوا ٹیلر ماسٹر فاروق کرال کا....

جو ذہین تھا...جس کی آنکھوں میں شرافت اور خوبصورتی ہمیشہ جھلکتی تھی.... ایک بار میں اُسکی دکان میں داخل ہوا۔ تو کانوں سے ایک آواز ٹکرائی....

''تمہاری موجودگی نافرمانی کی دلیل ہے...''

''انارکلی قید کرلی گئی ہے۔اور میں دیکھتا رہا۔مگر آج ظلِ الاہی کو اپنے ظلم اور میرے ضبط کی حد مقرر کرنی ہوگی۔''

''اگر تمہاری آرزوئیں کنیز ہے۔ایک باندی ہے تو ساری زندگی اسی طرح ضبط کرنا ہوگا____''

''کیا پروردگار عالم سے آپ نے مجھے اسی لئے مانگا تھا کہ زندگی مجھے ملے اور اس کے مالک آپ....''

کیونکہ یہ فلم مجھے پسند تھی۔میرے لئے دلچسپیوں سے بھرپور تھی۔میں نے کہا،

''فاروق یہ کیسٹ میں سنوں گا...''

''آپ سنیں گے۔'' اُس نے خوشی کا مظاہرہ کیا۔فوراً بولا

''شوق سے سُنئے...!''

تھوڑی دیر بعد اُس نے جب تہہ کر کے بچوں کی وردی تھمادی۔فلم مغل اعظم کے ساونڈ ٹریک کا تین کیسٹوں کا ایک سٹ بھی تھمادیا____میری نگاہوں میں اُس کی وقعت اور بڑھ گئی۔واقعی وہ ایک ہونہار لائق نوجوان تھا....

سردیوں کی دوپہر تھی۔اچھی دھوپ نکل آئی تھی۔کرفیو تھا۔سویرے بازار

کے مین چوک میں ٹھیک رعناواری ہسپتال کے سامنے فائرنگ ہوئی تھی...لوگ باگ کہہ رہے تھے۔کہ اس میں ایک بی ایس ایف اہلکار مارا گیا ہے... اسکے فوراً بعد علاقے میں کرفیو لگادیا گیا۔دن روزہ داری کے تھے۔لوگ گھروں میں ہی بیٹھے تھے۔قریب بارہ بجے دوبارہ فائرنگ ہوئی۔دھن۔دھن(Two shots)

میں اپنے کمرے میں دُبکا سا بیٹھا رہا۔شام ہوئی تو کرفیو میں دو گھنٹے کی ڈھیل دے دی گئی۔ میں بھی سگریٹ وغیرہ لانے کے لئے گھر سے نکلا۔بازار میں اچانک میرے کان کھڑے ہوگئے

ایک ہمسایہ دوسرے سے کہہ رہا تھا

''بڑے چوک میں فاروق کرال کو بی،ایس،ایف نے مارڈالا ہے''

''مارڈالا ہے......!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا

''مگر کیوں ـــــ کیوں مارڈالا؟''

کوئی کچھ نہ بولا

میں تیزی سے آگے اُسکے گھر کی طرف نکل گیا

تحیّر کی وہی جانی انجانی لہر میرے سارے وجود کو سنسنا گئی تھی۔ایک غم ناک بے بسی مجھے اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔

کچھ روز بعد کرفیو اُٹھا۔معلوم ہوا... بی ایس ایف کا کوئی بڑا آفیسر موقع واردات پر آیا تھا۔اور اہلکار کی لاش اُٹھوا کر چلا گیا ـــــ اُس کے جانے کے چند منٹ بعد کچھ اہلکار فاروق کرال کے گھر کے سامنے آگئے۔دروازہ اندر سے بند پاکر

زور سے کھٹکھٹایا...

تھوڑی دیر کے بعد فاروق کرال کا بوڑھا باپ باہر نکلتا ہے

''جناب کیا بات ہے۔؟''

''مٹی کے تیل کی ایک بوتل ہمیں چاہئے...''

بوڑھا اندر جا کے مٹی کے تیل کی بوتل لاتا ہے۔ اہلکار بوتل پکڑتا ہے۔ کچھ سوچنے کے بعد کہتا ہے

''وہ ـــــ تمہارا بیٹا کہاں ہے۔ نظر ہی نہیں آتا''

''جناب کون سا بیٹا....؟''

''وہ جو دکان پہ بیٹھتا ہے.. ٹیلر ماسٹر...''

''جناب وہ بیچارہ تو بیمار ہے، اندر سویا پڑا ہے..''

''ذرا اُس کو بُلاو...'' اہلکار حکم دیتا ہے

بوڑھا چارو نا چار اندر چلا جاتا ہے۔ ۲۱ سالہ جوان بیٹے کو باہر نکالتا ہے۔ اہلکار اُسے دروازے کے باہر کھینچ کے لے جاتے ہیں۔ اور ٹھیک اُسکی دکان کے سامنے لے جا کر ایک گولی اُسکے سینے میں داغ دیتے ہیں۔ پھر دوسری گولی... یہ منظر جن لوگوں نے گھروں کے اندر چھپ کے دیکھا تھا... وہ سب تھرائے سے نظر آ رہے تھے...

فاروق کے بوڑھے باپ نے کہا

''دوسرے فائر پر وہ ٹھیک نالی کے سامنے، گر گیا۔ اُسے سخت پیاس لگ

گئی۔وہ نالی کے گندے پانی کو کچھ دیر تک تکتا رہا... پھر اُسکی طرف بڑھنے لگا... مگر افسوس نالی کا پانی بھی نصیب میں نہ تھا... اُسی پل دم نکل گیا —— حیرت سے اُس کی آنکھیں کھلی رہ گئیں...''

وہ حیرت جیسے اُس کی آنکھوں سے نکل کر میری اپنی آنکھوں میں ٹھہر سی گئی ہے... فاروق کرال ملی ٹنٹ نہیں تھا۔کوئی شرارتی تو نہیں تھا۔وہ ایک ہونہار ذہین... قابل ٹیلر ماسٹر تھا بس۔

اُسکی موت کے ساتھ ہی ایک کہانی ختم ہوگئی۔اُس کی دُکان کا سونا پن کئی سال تک میرا پیچھا کرتا رہا۔مجھے پریشان کرتا رہا۔پھر پانچ چھ سال بعد اُسکے چھوٹے بھائی کو اُسی دکان پر ٹیلرنگ کا کام کرتے ہوئے دیکھا۔لیکن میرا دل تو چھلنی ہوا تھا۔میں پھر اُس دُکان پر کبھی گیا نہیں۔

فاروق کرال کہاں چلا گیا اچانک...؟

حیرت... سب کچھ جان کر بھی انجان سا بنا میں....

وہ دو چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہُنر مند ہاتھ کیوں بے حرکت کر دئے گئے —— ؟اُس کا قصور کیا تھا....؟

کوئی کچھ نہیں کہتا ہے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے۔میری کہانی کا اُداس پن بڑھ جاتا ہے۔میرا کینوس پھیل جاتا ہے۔میں تھوڑا سا خوش بھی ہو رہا ہوں کہ میں کہانی کے قریب آ رہا ہوں ہم سب... کہانیاں ہیں............

☆☆☆

ایک بڑی کہانی ہے ـــــ جو شروع ہو چکی ہے

میرے پیدا ہونے سے پہلے ہی

ایک باغ....جنت...خدا...فرشتے...ابلیس اور مٹی کا پُتلا آدم ـــــــ

(و نفَختُ فیهِ مِن روحی)

پھر میں نے اُس میں اپنی روح پھونک دی

پھر ارشاد کیا فرشتوں سے

بتاؤ مجھ کو اسماء ان چیزوں کے

فرشتوں نے عرض کیا۔ آپ تو پاک ہیں۔ ہم کو کوئی علم نہیں مگر وہی جو کچھ آپ نے ہم کو علم دیا...

ـــــ اے آدم ـــــ تم بتلاؤ۔"

اور اُس نے اسماء بتلا دیئے ـــــ

یہ ایک حقیقت ہے..سچے خدا کا فرمان.....واقعے میں کہانی پن بھی ہے۔

میں اس کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں

بابر ایک حقیقت تھا

لیکن میرے سامنے وہ تاریخ کی کتابوں کا ایک صفحہ...ایک کردار ہے۔ ایک کہانی کے روپ میں ہے۔ گویا حقیقتیں ہی ہیں جو پھر کہانیاں بنتی ہیں۔ مگر واقعۂ کربلا کو میں محض ایک کہانی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ وہ کچھ اور بھی ہے۔ ایک پُر از گیان تحریک...ایک تازیانہ...حق و باطل کا ایک عظیم معرکہ ہے...

یہ عبرتناک واقعات تاریخ کے جسم پر رقم ہیں۔ لیکن تاریخ بے اثر ہے۔ بے رحم ہے۔ ایک ایسا صفحہ ہے۔ جس پر پہلے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے...دریا بہتا رہتا ہے۔

درخت میں موسم نے جان دی۔ یالی۔ تاریخ کے لئے یہ سورج کے گردشی چکر ہیں۔ چکر جاری ہے اور کہانی بھی جاری.......!

میرے دوست

میں پھر اُس دوراہے پہ آ کھڑا ہوا ہوں

جہاں پر کہ میں اکثر سوچتا ہوں.... کہ کس طرف جاؤں کس ایک کا ساتھ دوں....!

میرے دائیں بائیں میرے دونوں دوست ہیں۔ وہ جو زہر کا پُجاری ہے میری جیبیں ٹٹولنے کے بعد زہر نہ پاکر کچھ اُداس سا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مچل اُٹھتا ہے۔ آہستگی سے مجھے ترغیب دیتا ہے کہ میں خرید لاؤں بازار سے

میں خاموشی سے اپنے دوسرے دوست کی طرف دیکھتا ہوں۔ میرا یہ دوست خوشبوؤں، پھلوں اور میٹھی چیزوں کا شیدائی ہے، زہر اور زہریلی چیزوں سے نفرت کرتا ہے... بلکہ مجھے بھی اکثر نصیحتیں کرتا ہے کہ میں ایسے کام دھندوں میں اپنے دوست کا ساتھ نہ دوں..... لیکن اِس وقت وہ جانے کیوں بالکل لاتعلق سا نظر آتا ہے... ایک لفظ بھی منہ سے نہیں بولتا۔

میں زہر کے پجاری کے لئے ایک چھوٹی سی پُڑیا بازار سے خرید لیتا ہوں اور اُسے تھما دیتا ہوں۔

وہ جیب سے پانی کی بوتل اور ایک چھوٹا سا گلاس نکال دیتا ہے... زہر پانی کے ساتھ ملا کر پی لیتا ہے... پینے کے بعد اُس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوتی ہے.... کبھی وہ میٹھے درد بھرے نغمے گاتا ہے. کبھی وہ بے تکان باتیں کیے جاتا ہے اور کبھی منتشر اور بے چین سا دکھائی دیتا ہے۔ پھر دور خلاؤں میں جانے کیا ڈھونڈنے لگتا ہے... مگر آج ــــــ اس وقت وہ بالکل خاموش سا ہو گیا ہے۔

خوشبوؤں، پھلوں اور میٹھی چیزوں کا شیدائی میرے قریب ہوتے ہوئے بھی نہیں ہے کیونکہ اُس کا دھیان میری طرف نہیں ہے۔ وہ بھی اپنے ہی اندر کہیں ڈوب گیا ہے۔

میں اُسے آواز دیتا ہوں........

"ہے... میرے اچھے دوست..."

لیکن وہ کوئی جواب نہیں دیتا ہے

جب یہ دونوں دوست میرے خاموش ہو گئے ہوں ــــــ تب میں بھلا کیا بول سکتا ہوں....

میں بھی خاموشی کی لحاف اوڑھے ہوئے ہوں

زہر کا پُجاری اپنے لئے دوسرے گلاس میں زہر ملا رہا ہے۔ خوشبوؤں اور پھلوں کا شیدائی بدستور خاموش اور گم صُم سا ہے... ایسے میں اچانک ایک خیال میرے ذہن میں کوندتا ہے... کیوں نہ میں کہیں دور بھاگ جاؤں.... دونوں سے دور.... کہیں پرے.... جہاں میں صرف میں رہوں... اکیلا. تنہا.... الگ... اپنی مرضی

کا مالک.... اپنے آپ کا بندہ... آزاد.... ایک جھرنے کی طرح ـــــــ لیکن میرے دونوں دوست بڑے شاطر ہیں ۔ نہ معلوم کیسے میرے ارادے کو بھانپ لیتے ہیں ۔ یکا یک ہی اُن کے مضبوط ہاتھ میرے کندھوں سے جا لگتے ہیں... میں اندر ہی اندر اپنی بے چارگی پر رو دیتا ہوں ..... لیکن پھر کچھ دیر بعد آگے نکل جاتا ہوں۔

☆☆☆

ا۔ل۔ر۔ع

Short Stories Collection

Aangan Mein Vouh

Mushtaq Mehdde

قلمی نام: مشتاق مہدیؔ

اصلی نام: مشتاق احمد شاہ

پیدائش: شہر سرینگر

تالیف: افسانہ، ڈرامہ، شاعری ......

مشتاق مہدیؔ کے افسانوں میں بیان کنندہ ایک عاید کردہ کردار نہیں۔ وہ مصنف کی گرفت سے نکل کر افسانے کے تخیلی ماحول میں تداخل کا ارتکاب نہیں کرتا۔ اس کے برعکس وہ افسانے کی فرضی دنیا کا زائدہ اور پرداختہ کردار ہے۔ وہ افسانوی دنیا میں اپنے فائدے کی باریکی، نفسیاتی کوائف اور فضا سازی میں کسی گراں باری سے نہیں بلکہ برجستگی سے نمو پزیر ہوتے ہیں یعنی اپنے اسلوبِ گفتار اور عمل اور ردِ عمل کو مربوط، رواں اور منضبط ارتقائی صورت میں پیش ہی نہیں کرتے بلکہ اپنے تجربات کو چھوٹے چھوٹے جملوں میں سریلی انداز میں رمز دے کر ہی اُبھارتے ہیں۔ اس طرح سے اُن کے افسانے پامال شدہ حقیقت نگاری کی نذر نہیں ہوتے۔

(پروفیسر حامدی کاشمیریؔ)